درجہ — 10

درخشاں

حصّہ - 2

INDIAN ARMY

Arms you FOR LIFE AND CAREER AS AN OFFICER

Visit us at www.joinindianarmy.nic.in

or call us (011) 26173215, 26175473, 26172861

Ser NO	Course	Vacancies Per Course	Age	Qualification	Appln to be received by	Training Academy	Duration of Training
1.	NDA	300	16½ - 19 Yrs	10+2 for Army 10+2 (PCM) for AF, Navy	10 Nov & 10 Apr (by UPSC)	NDA Pune	3 Yrs + 1 yr at IMA
2.	10+2 (TES) Tech Entry Scheme	85	16½ - 19½ Yrs	10+2 (PCM) (aggregate 70% and above)	30 Jun & 31 Oct	IMA Dehradun	5 Yrs
3.	IMA(DE)	250	19 - 24 Yrs	Graduation	May & Oct (by UPSC)	IMA Dehradun	1½ Yrs
4.	SSC (NT) (Men)	175	19 - 25 Yrs	Graduation	May & Oct (by UPSC)	OTA Chennai	49 Weeks
5.	SSC (NT) (Women) (including Non- tech Specialists and JAG entry)	As notified	19 - 25 Yrs for Graduates 21-27 Yrs for Post Graduate/ Specialists/ JAG	Graduation/ Post Graduation /Degree with Diploma/ BA LLB	Feb/Mar & Jul/ Aug (by UPSC)	OTA Chennai	49 Weeks
6.	NCC (SPL) (Men)	50	19 - 25 Yrs	Graduate 50% marks & NCC 'C' Certificate (min B Grade)	Oct/ Nov & Apr/ May	OTA Chennai	49 Weeks
	NCC (SPL) (Women)	As notified					
7.	JAG (Men)	As notified	21 - 27 Yrs	Graduate with LLB/ LLM with 55% marks	Apr / May	OTA Chennai	49 Weeks
8.	UES	60	19-25 Yrs (FY)18-24 Yrs (PFY)	BE/B Tech	31 Jul	IMA Dehradun	One Year
9.	TGC (Engineers)	As notified	20-27 Yrs	BE/ B Tech	Apr/ May & Oct/ Nov	IMA Dehradun	One Year
10.	TGC (AEC)	As notified	23-27 Yrs	MA/ M Sc. in 1st or 2nd Div	Apr/ May & Oct/ Nov	IMA Dehradun	One Year
11.	SSC (T) (Men)	50	20-27 Yrs	Engg Degree	Apr/ May & Oct/ Nov	OTA Chennai	49 Weeks
12.	SSC (T) (Women)	As notified	20-27 Yrs	Engg Degree	Feb/ Mar & Jul/ Aug	OTA Chennai	49 Weeks

وَندے ماترم

وَندے ماترم

سُجلام سُفلام مَلیج شیتلام،

شسے شیام لام ماتَرم

وَندے ماتَرم!!

شُوبھر جیوتسنا پلکت یا میٖنیم،

پھُل کو سُومت دُرم دَل شُوبھینیم

سُوہاسنیم سومدھر بھاسنیم،

سُوکھدام وَردام ماتَرم!!

وَندے ماتَرم!!

L SOLUTIONS
ABSOL
PATNA

DARAKHSHAN

PART - 2

(Urdu Textbook for Class-X)

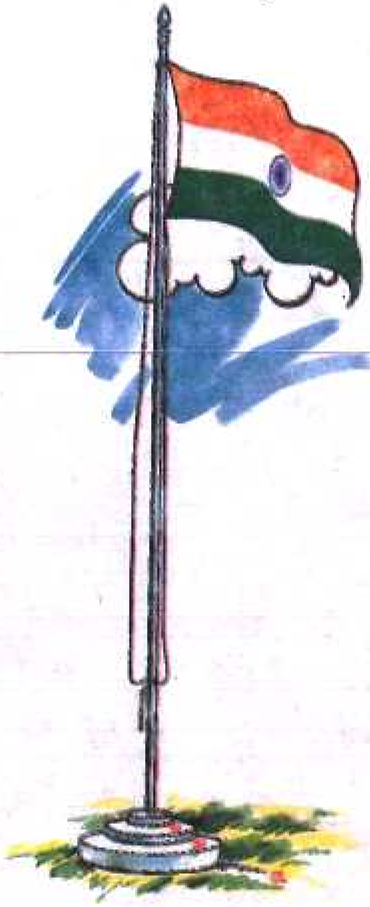

ABDIEL SOLUTIONS
ABSOL
PATNA

قومی ترانہ

جَن گَن مَن اَدھینایک جیہ ہے
بھارت بھاگیہ وِدھاتا !
پنجاب سندھو گجرات مراٹھا
دراوڑ اُتکل بنگ !
وِندھیہ ہماچل یمنا گنگا
اُچھل جل دھی ترنگ !
تو شبھ نامے جاگے،
تو شبھ آشش ماگے،
گاہے تو جے گاتھا !
جَن گَن منگل دایک جیہ ہے
بھارت بھاگیہ وِدھاتا !
جیہ ہے، جیہ ہے، جیہ ہے،
جیہ جیہ جیہ، جیہ ہے !

बिहार स्टेट टेक्स्टबुक पब्लिशिंग कॉरपोरेशन लिमिटेड, बुद्ध मार्ग, पटना–1
BIHAR STATE TEXTBOOK PUBLISHING CORPORATION LTD., BUDH MARG, PATNA-1

मुद्रक : बिहार ऑफसेट, जामुन गली, पटना-800 004

حمد

حمد کے لغوی معنی خدا کی تعریف کے ہیں۔ اردو شاعری میں دوسری اصناف کی طرح حمد بھی ایک مقبول صنف ہے جس میں خدائے رب العزت کی صفات بیان کی جاتی ہے۔ اردو کے تمام شاعروں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جس نے حمد نہ کہی ہو۔ کوئی بھی کلام ہو، اس کی شروعات حمد کے ساتھ ہی کی جاتی ہے چونکہ خدا کے نام سے کسی کام کا آغاز کرنا متبرک سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے بلا تفریق مذہب وملت اردو کے تقریباً ہر بڑے اور چھوٹے شاعر نے حمد میں خامہ فرسائی کی ہے اور اپنے قدرتِ سخن کا مظاہرہ کیا ہے۔

خدا خالق کائنات ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ اس کی ذات یگانہ اور یکتا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ چنانچہ حمد کے اشعار میں صرف اسی ذات واحد کی صفات کو بیان کیا جاتا ہے۔ چونکہ خدا کی صفات کی کوئی حد نہیں بلکہ وہ بحر بیکراں ہیں اس لئے شاعر کے لئے بہرحال اس بات کی کافی گنجائش رہتی ہے کہ وہ جس قدر چاہے خدا کی بے شمار صفتوں کو بیان کرے اور دراصل یہی اس صنف کی خاص خوبی ہے۔

حمد میں جہاں خدائے رب العزت کی صفات کا بیان ہوتا ہے، وہیں نعت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں مدحیہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح منقبت میں بزرگانِ دین، خلفائے راشدین اور اولیاءاللہ کی منظوم تعریف کی جاتی ہے تو قصیدہ میں کسی بھی شخص کے اوصاف حمیدہ نظم کئے جاتے ہیں۔

شبنم کمالی

جناب شبنم کمالی کا تعلق ریاست بہار سے ہے، ان کا اصلی نام مصطفی رضا ہے، شبنم تخلص ہے۔ان کی پیدائش 22/جولائی 1938ء کو پوکھریرا (ضلع سیتامڑھی) میں ہوئی۔

ان کی مذہبی منظومات خاص طور پر نعتیہ شاعری کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ان میں انوارِ عقیدت، ریاض عقیدت، ضیائے عقیدت، فردوس عقیدت اور صہبائے عقیدت مشہور ہیں۔غزلوں اور نظموں کے بھی کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔نصاب میں شامل یہ حمد بعنوان 'حمد خدائے عزوجل' جناب شبنم کمالی کی ہی تخلیق ہے۔

شبنم کمالی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ وعظ و تبلیغ اسلامی اور مذہبی اقدار کی تلقین میں صرف کی ہے۔وہ اللہ اور اس کے پیارے نبی محمد رسول اللہؐ کے عاشق صادق تھے۔چنانچہ اپنی تقریروں اور شعری تخلیقات میں انہوں نے اپنے بھرپور والہانہ جذبات کا اظہار کیا ہے۔

حمدِ خدائے عزوجل

خالقِ دو جہاں ہے تو ایزدِ ذوالجلال ہے
یکتا ہے تیری ذاتِ پاک عالی و بے مثال ہے

تیرے ہی بابِ فیض سے ملتا ہے دو جہاں کو رزق
سب کی حیات و موت کا مولا تجھے خیال ہے

قدرتِ خاص کا تری عکس ہے بزمِ کائنات
کون و مکاں میں جلوہ گر تیرا ہی اک جمال ہے

قائم ہے تیرے حکم سے آج بھی نظمِ زندگی
تیرے سوا کہیں ملے تو یہ زندگی محال ہے

صاحب عقل و فہم کو ناز ہے تیری ذات پر
نام سے تیرے دو جہاں واقفِ حال و قال ہے

لاکھ برس اگر کوئی حمد و ثنا تری کرے
ہو سکے حق ادا ترا ممکن نہیں محال ہے

ظلمتِ دہر میں ہمیں نورِ سحر کی ہے تلاش
لطف و کرم کی اک نظر مولا یہ عرضِ حال ہے

مقصدِ نیک میں سدا کردے ہمیں تو کامیاب
تیرے حضورِ خاص میں اپنا یہی سوال ہے

شبنمِ بے نوا کو بھی دے دے عروجِ بندگی
فکرِ طلب کی راہ میں آج یہ پائمال ہے

لفظ و معنی

حمد - خدا کی تعریف
عزوجل - عزت اور بڑائی والا
ذوالجلال - مرتبے والا، عظمت والا
خالق - پیدا کرنے والا
نظم - انتظام
یکتا - اکیلا، لاشریک

ثنا	۔	تعریف
محال	۔	ناممکن
حال وقال	۔	کیفیت
ظلمت	۔	اندھیرا
دہر	۔	دنیا
عروج	۔	ترقی
فکر	۔	خیال
بے نوا	۔	خاموش

آپ نے پڑھا

- حمد کے ان اشعار میں خدا کی بارگاہ میں عقیدت اور محبت کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ خالق کائنات کی ستائش الفاظ میں ممکن نہیں لیکن بندہ اپنے طور پر اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی حمد وستائش میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اس نظم میں شاعر یہ بتاتا ہے کہ اللہ دونوں جہاں کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس کی پاک ذات کی کوئی دوسری مثال نہیں دی جاسکتی۔ وہ دونوں جہاں کو رزق پہنچاتا ہے اور ساری کائنات کی حیات وموت کا مالک ہے۔ پوری کائنات میں اسی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اسی کا حسن ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ اسی نے زندگی کا نظام مرتب کیا ہے۔ عقل والے لوگ اس کی ذات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ کام انسان کی حد سے باہر ہے۔ اگر لاکھوں لاکھ برس بھی خدا کی شان بیان کی جائے تو وہ بھی ناکافی ہوگی۔ کسی بندے پر اگر اس کی مہربانی کی نظر پڑ جائے تو وہ کامیاب ہوجاتا ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. شبنم کمالی کب پیدا ہوئے؟
2. شبنم کمالی کہاں پیدا ہوئے؟
3. شبنم کمالی کا انتقال کب ہوا؟
4. کائنات کی تخلیق کس نے کی ہے؟

5. انسان کی مشکلوں کو کون حل کرتا ہے؟

6. شبنم کمالی کا اصل نام کیا ہے؟

مختصر سوالات

1. حمد کسے کہتے ہیں؟ پانچ جملوں میں لکھیے۔

2. حمد، منقبت اور قصیدے میں کیا فرق ہے؟

3. شبنم کمالی کے تین شعری مجموعوں کے نام بتائیے۔

4. حمد اور نعت میں بنیادی فرق کیا ہے؟

طویل سوالات

1. شاملِ نصاب حمد کے پہلے شعر کی تشریح کیجیے۔

2. شبنم کمالی کی شاعرانہ خصوصیات بیان کیجیے۔

3. حمد کا خلاصہ لکھیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. لائبریری جا کر کسی چار شاعروں کے حمدیہ اشعار کو اپنی کاپی میں لکھیے۔

ABDIEL SOLUTIONS ABSOL PATNA

مختصر افسانہ

مختصر افسانہ اردو نثر کے تخلیقی ادب میں سب سے کم عمر اور نوخیز صنف ہے لیکن اس صنف نے اپنی کم عمری اور نوخیزی کے باوجود ایسی فنی پختگی اور مقبولیت حاصل کرلی جس سے سرسری طور پر گزر جانا کسی کے لئے بھی اب ممکن نہیں ہے۔ یہ صنف قدم قدم پر فکر و فن کا ایسا جلال و جمال پیش کرتی ہے جس سے ذہن کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ اس کے آئینے میں ہمیں جہاں اپنے ملک، قوم اور سماج کی تصویر نظر آتی ہے، وہیں ہماری زندگی میں پیش آنے والی دشواریوں یا غم والم اور مسرت وشادمانی کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اردو میں مختصر افسانہ مغربی ادب کے زیر اثر وجود میں آیا اور بہت کم عرصے میں اس نے اردو میں ایک اہم صنف کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرلی اور عام لوگوں کے درمیان اسے خوب مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

افسانے کی متعدد تعریفیں کی گئی ہیں۔ ایک ممتاز مغربی ادیب کا کہنا ہے کہ افسانہ ایسی نثری کہانی ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جا سکے۔ کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ افسانے میں بنیادی شئے وحدت تاثر ہے۔ بہر حال ادب اور فن کے ماہرین نے اس کی جو بھی تعریفیں بیان کی ہیں ان سب کے درمیان ایک خیال مشترک ہے کہ افسانہ نثر میں ایک مختصر بیانیہ تخلیقی صنف ہے۔ افسانے میں کسی ایک کردار یا کرداروں کے ایک مخصوص گروہ کے نقوش یا ذہنی کشمکش کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ افسانے میں واقعات کی تفصیل، کرداروں کی گفتگو اور منظر و ماحول کی پیش کش بہت نپی تلی اور متوازن ہوتی ہے۔

اردو میں مختصر افسانے کا آغاز بیسویں صدی کی ابتدا میں ہوا اور اس صنف نے تقریباً اپنے سو سالہ سفر میں کئی نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ متفقہ رائے کے مطابق اردو کا پہلا مختصر افسانہ 'نصیر اور خدیجہ' کو تسلیم کیا جاتا ہے جو 1903 میں شائع ہوا۔ اس کے مصنف راشد الخیری تھے۔ اس کے بعد پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کے افسانے سامنے آئے۔

1936 میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ اس سے چند سال قبل 'انگارے' کے نام سے ایک مجموعہ شائع ہو چکا تھا، جس نے موضوع اور فن دونوں اعتبار سے اردو کے مختصر افسانے کی تاریخ میں نئے تجربوں کی بنیاد ڈالی اور یہ مجموعہ آج بھی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

1960ء کی دہائی میں جدید افسانہ نگاروں کی ایک نئی نسل ابھر کر سامنے آئی جس نے حقیقت نگاری سے انحراف کیا اور افسانے میں علامت، استعارہ، تمثیل اور تجرید کی آمیزش کر کے اردو کے افسانے کا افق مزید وسیع کیا۔ اس عہد کے افسانہ نگاروں میں انتظار حسین، سریندر پرکاش، انور سجاد، بلراج کومل، غیاث احمد گدی اور کلام حیدری وغیرہ بہت اہم ہیں۔

اردو افسانے کی تاریخ میں منشی پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، رام لعل، شکیلہ اختر اور جوگندر پال کی خدمات کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے ہیں۔

سہیل عظیم آبادی

سہیل عظیم آبادی کا اصل نام سید مجیب الرحمن ہے۔ اپنی ابتدائی زندگی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ اسی لئے سہیل تخلص کرتے تھے۔ اس طرح ادبی دنیا میں سہیل عظیم آبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔ سہیل عظیم آبادی کی پیدائش 1911ء میں پٹنہ میں ہوئی۔ سہیل صاحب ایک زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک سال کی عمر میں والدہ کا انتقال ہوگیا اور پرورش نانیہال میں ہوئی۔ ایک معلم کی سرپرستی میں وہیں ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل ہوئی۔ ویسے ان کا آبائی وطن شاہ پور، بھدول ہے جو پٹنہ ضلع میں ہی واقع ہے۔ افتادِ طبع کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرسکے۔ گرچہ مظفرپور، حیدرآباد اور کلکتہ جیسے علمی مراکز میں قیام پذیر رہے۔ ابتداء شاعری سے کی لیکن آگے چل کر افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور بیشمار افسانے لکھے۔

سہیل عظیم آبادی نے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت اختیار کی۔ اس ملازمت کے سلسلے میں دہلی میں رہے پھر ان کا تبادلہ سری نگر کشمیر ہوگیا پھر وہ واپس پٹنہ چلے آئے اور ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس سے پہلے صحافت میں بھی مصروف رہے۔ رسالے نکالے اور ایک روزنامہ اخبار 'ساتھی' کا اجراء کیا۔

سہیل عظیم آبادی زندگی بھر اردو کی ترویج و اشاعت میں مصروف رہے۔ چنانچہ انہوں نے چھوٹا ناگپور کے علاقے میں پانچ سات برسوں تک اردو کی ترویج و اشاعت کا کام کیا۔ زمیندارانہ ماحول سے تعلق اور چھوٹا ناگپور کے قیام نے ان کے افسانوں کے موضوعات متعین کردیئے۔ ان کے اکثر و بیشتر افسانے زمینداروں کے استحصال کے خلاف مزدوروں اور کمزور طبقوں کی حقوق جیسے موضوعات سے متعلق ہیں۔

سہیل عظیم آبادی کی تخلیقات میں ان کے تین افسانوی مجموعے 'چار چہرے'، 'الاؤ'، اور 'آدمی کے روپ ہیں' اور ایک ناول 'بے جڑ کے پودے' ہے۔ ان مجموعوں کے علاوہ سہیل کے افسانوں کی تعداد ۱۲۵ تک پہنچتی ہے۔ 1980ء میں سہیل عظیم آبادی کا انتقال ہوگیا۔

بھابی جان

جب رقیہ بھابی یاد آتی ہیں تو میرا سر خود بخود جذبۂ احترام سے جھک جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان کی ذات سراپا روشنی ہے۔ ان کی یاد کے ساتھ ساتھ مجھے وہ شمع یاد آجاتی ہے جو کلیسا کی اونچی قربان گاہ پر جلتی اور پگھلتی رہتی ہے اور جب پادری عبادت ختم کر کے قربان گاہ سے اتر جاتا ہے تو بھی وہ خاموش زبان سے خداوند یسوع کا پیغام سناتی رہتی ہے جو دوسروں کا گناہ بخشوانے کے لئے صلیب پر چڑھایا گیا۔ مگر وہ جواب تک زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا اور سب کو نجات دلائے گا۔

رقیہ بھابی کی ذات مجھے ایسی ہی شمع معلوم ہوتی ہے جو جلتی اور پگھلتی رہتی ہے۔ لیکن روشنی پھیلاتی اور کچھ کہے بغیر بھی ہر وقت ایک پیغام سناتی رہتی ہے۔ ایسا پیغام جو امر ہے۔

بھابی نے صبح سویرے آواز دی——

'خیر تو ہے شہزادے! گھوڑے بیچ کر سوئے ہو۔ چائے ٹھنڈی ہورہی ہے۔'

بھابی کی آواز سن کر میں اٹھ بیٹھا۔ وہ مسکرادیں اور بولیں——

'بھئی بات یہ ہے کہ ٹھنڈی چائے مجھ سے پی نہیں جاتی اور بچوں کو اسکول بھیجنا بھی ہے۔'

'بھابی یہی تو مصیبت ہے آپ کے ساتھ۔ صبح ہوئی اور اٹھا کر بٹھا دیا۔ ہم لوگوں کو بھی آپ طالب علم سمجھتی ہیں؟'

بھابی بولیں—— 'تو آج تم کون بوڑھے ہو چکے ہو۔ بھئی اٹھو جلدی کرو۔'

بھابی نے ہاتھ پکڑا اور بستر سے کھینچ لیا۔ میں زمین پر کھڑا ہوگیا۔ وہ ہنسنے لگیں۔

میں بولا—— 'شکر ہے میں آپ کا اسٹوڈنٹ نہیں ہوا۔'

'باتیں نہ بناؤ۔ چائے ٹھنڈی ہورہی ہے۔ بچے بیٹھے ہیں۔'

'لیکن مجھے نیند آرہی ہے بھابی۔ رات بھر نہیں سو سکا ہوں۔' میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

'چائے کے بعد دوسری قسط سو لینا۔'

قسط کا لفظ سن کر میں ہنس پڑا۔ اور وہ بولیں۔۔۔

'شاعر ہو کر داد نہیں دیتے۔ کیا لفظ میں نے استعمال کیا ہے۔ اگر نوابان اودھ باقی ہوتے تو اس ایک لفظ کے استعمال پر ایک جاگیر تو ضرور بخش دیتے۔ چلو بھئی تم ذرا جلدی کرو۔ اتنا ہی سہی۔'

اور بھابی کھانے کے کمرے میں چلی گئیں۔ اور جب تھوڑی دیر میں میں میز پر پہنچا تو بچے چائے ختم کر رہے تھے۔ ننھی ریحانہ بولی۔۔۔

'چچا جان! ہم لوگ چائے ختم کر چکے ہیں۔ اب آپ ہماری جھوٹی چائے پیجیے۔'

اسکول کی لاری نے ہارن بجایا اور بچیاں تالی بجاتی ہوئی باہر چل دیں۔ بھابی نے چائے ڈھال کر میری طرف بڑھائی اور بولیں۔۔۔ 'اگر تم جوان اتنی دیر تک سوتے رہو گے تو کیا کرو گے۔'

'شعر کہوں گا اور کیا کروں گا۔'

'اور کچھ نہیں۔'

بھابی معنی خیز انداز سے مسکرائیں۔ میں کچھ جھینپ سا گیا۔ بھابی کی مسکراہٹ بہت دور تک اشارے کر رہی تھی۔ پھر وہ آہستہ سے بولیں۔۔۔

'تمہارے بھائی جان ٹھیک چار بجے اٹھ بیٹھتے تھے اور چائے پی کر کام شروع کر دیتے تھے۔ شروع میں تو مجھے بھی بڑا جبر ہوتا تھا لیکن آج صبح اٹھنے کی عادت کام آرہی ہے۔'

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بھابی کی سنگار میز پر ننھے بھائی کی خوبصورت سی رنگین تصویر رکھی ہوئی تھی۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ اس تصویر کے پاس بھابی اور بچوں کی تصویریں تھیں۔ اب سنگار میز نام کا تھا۔ اس پر بچوں کی کتابوں کا ڈھیر تھا اور شاید ایک کنگھی کے علاوہ میز پر سنگار کی کوئی دوسری چیز بھی نہ تھی۔ رقیہ بھابی اداس ہو گئیں اور بولیں۔۔۔

'اختر! نہ جانے تمہارے بھائی جان آج کس حال میں ہیں۔ دیکھو ان کے مقدمے کا کیا ہوتا ہے۔ ہزار میل

کی دوری پر میں ان کے کوئی کام بھی نہیں آسکتی۔ چند ہی دنوں میں ان کے مقدمے کا فیصلہ ہونے والا ہے۔'

بھابی جو ہمیشہ پھول کی طرح ہنسنے اور بلبل کی طرح چہکتے رہنے کی عادی تھیں بالکل اداس اور چپ تھیں۔

لیکن یکا یک کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ پھر آواز آئی۔

'میں آسکتی ہوں۔'

'آجاؤ۔' بھابی نے کہا۔

اور ایک جوان سی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ بھابی نے دیکھتے ہی کہا۔

'آؤ شمی! چائے پیو۔ میں آج شام کو تمہارے گھر جانے والی ہی تھی۔ بن دیئے تم نے سوئیٹر؟'

'وہی لے کر آئی ہوں۔ اون بچ گیا تھا تو میں نے ٹوپی اور موزے بھی بُن دیئے۔'

'بہت اچھا کیا تم نے۔ لو چائے پیو۔'

اور چائے کی پیالی لڑکی کے سامنے بڑھادی۔ لڑکی میری موجودگی میں کچھ شرمارہی تھی۔ بولی۔

'میں چائے پی چکی ہوں۔'

'پھر بھی پی لو۔ شرماتی کیوں ہو؟ یہ ہیں مشہور شاعر اختر۔ تمہارے بڑے بھائی ہیں۔'

میں ناشتہ ختم کر چکا تھا۔ اٹھ کھڑا ہوا۔

'بھابی میں ذرا شہر سے ہو آؤں؟'

'جاؤ۔ مجھے بھی ذرا ہسپتال جانا ہے۔ چلو شمی تم بھی ساتھ۔'

میں نے کمرے کی کھڑکی سے بھابی کو بنگلے کے احاطے سے باہر جاتے دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں دودھ کی وہ بوتل تھی جو بہت دیر سے میز پر رکھی ہوئی تھی۔ یہ تو مجھے دو دن کے بعد معلوم ہوا کہ بھابی کے ایک پرانے ملازم کی بیٹی ہسپتال میں ہے۔ دو مہینے پہلے اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کے بچہ پیدا ہوا ہے اس کا کوئی بھی دیکھنے والا نہیں۔ بھابی خود ہی دونوں وقت دودھ کی بوتل لے کر دو فرلانگ پیدل جاتی اور دودھ پہنچاتی ہیں اور سوئیٹر اور موزے اسی بچے کے لئے بنوائے تھے۔ کیونکہ سردی کا موسم شروع ہو رہا تھا اور شمی ان کے کالج کی ایک غریب طالب علم تھی جو صرف ان کی مدد کے سہارے پڑھ رہی تھی۔

بھابی سے میری صرف دوسری یا تیسری ملاقات تھی۔ البتہ خط و کتابت بہت زیادہ تھی۔ لیکن تین دن ساتھ رہ کر معلوم ہوا کہ وہ آدمی نہیں، مشین تھیں۔ صبح اٹھ کر کام شروع کر دیتیں ان کا زمانہ بھی بالکل بدل چکا تھا۔ کبھی چار پانچ نوکر اور ماما ئیں ہوتی تھیں، اب ان کے پاس صرف ایک نوکر تھا جو بازار سے سودا لاتا تھا اور کھانا بھی پکاتا تھا۔ پھر روپیوں کی بھی بڑی تنگی تھی۔ پہلے وہ ہزاروں روپے ماہوار اپنے شوق پر خرچ کر دیا کرتی تھیں۔ اب چار سو روپے ماہوار پر ایک کالج میں لکچرر تھیں اور پچاس روپے ماہوار ایک لڑکی کو پڑھانے کے ملتے تھے۔ لے دے کر یہی ان کی آمدنی تھی۔ اور خرچ اپنی جگہ پر۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی۔ اپنے اور بچوں کا خرچ ہوتا تو کسی طرح پورا ہو جاتا۔ لیکن وہ بھی بڑھ گیا تھا۔ بچوں اور اپنی ضرورتوں کے علاوہ ایک مستقل رقم انہیں ہر مہینہ مزدوروں اور طالب علموں کی انجمنوں کو دینا پڑتی تھی۔ کانفرنسوں اور جلسوں میں شرکت کے لئے کرایہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ کئی غریب لڑکیاں صرف ان کی مدد سے پڑھ رہی تھیں۔

بھائی جان کی جب شادی رقیہ بھابی سے ہوئی تھی۔ تو ہم لوگوں کا عام خیال تھا کہ یہ شادی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف بھائی جان تھے، جنھیں ایسی سیاست سے شوق تھا، جو بار بار انہیں جیل بھجوایا کرتی تھی اور دوسری طرف بھابی جان تھیں، جو نازوں کی پالی تھیں اور ایسی ماحول میں بڑھ کر جوان ہوئی تھیں جس میں اپنی ہی ذات سب کچھ ہوتی ہے اور ہم لوگوں نے شادی کی خبر سنتے ہی سوچ لیا تھا کہ بھابی جس طرح ابھی میکے میں شان سے رہتی ہیں، رہا کریں گی اور بھائی جان جیل میں رہیں گے۔ بعضوں کا تو یہ خیال تھا کہ بھائی جان بھی سیاست کے چکر سے نکل کر بیرسٹری کریں گے اور اپنی عالی شان کوٹھی میں شان کی زندگی گزاریں گے یا پھر آرام کرسی والی سیاست چلے گی اور کتابوں کی باتیں دہرائیں گے۔ لیکن سب کا خیال غلط نکلا۔ بھائی جان نے رقیہ بھابی کو اپنے رنگ میں جلد ہی رنگ دیا۔ اور وہ قدم بقدم ساتھ چلنے لگیں اور شادی کے بعد جیسے ہی بھائی جان گرفتار ہوئے اور انہیں دو سال کی سزا ہو گئی۔ بھابی جان نے اپنے لئے راہ تلاش کر لی۔ بی۔ اے وہ پہلے ہی کر چکی تھیں۔ جلد ہی تیاری کر کے ایم اے کر لیا اور کالج میں لکچرر ہو گئیں اور اکلوتی بچی کی دیکھ بھال میں لگ گئیں۔

دو سال کے بعد جب پھر بھائی جان جیل سے آئے تو اپنی سرگرمیوں میں رہے اور بھابی جان کام کرتی رہیں۔ پھر دو بچے اور ہوئے اور وہ انہیں پالتی رہیں۔ اب بھائی جان تین سال سے نظر بند تھے اور ان پر مقدمہ چل

رہا تھا تو بھابی جان بے شمار ذمہ داریوں اور غم کا بوجھ اٹھائے پھرتی تھیں۔ لیکن ان کا چہرہ کبھی میلا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے غم کو اپنے لئے مسرت سمجھنے لگی ہیں اور غم میں بھی خوشی کا پہلو نکال ہی لیتی ہیں۔

وہ صبح سویرے اٹھتیں، بچوں کو نہلاتیں، ان کے کپڑے بدلتیں، خود نہا دھو کر تیار ہو جاتیں۔ بچوں کو کھلا پلا کر سات بجے اسکول بھیج دیتیں۔ پھر ملنے والوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ طرح طرح کے لوگ ان سے ملنے آتے اور طرح طرح کی فرمائشیں کرتے۔ کوئی ان سے ملازمت کے لئے سفارش کرنے کو کہتا، کوئی کسی اور کام کے لئے۔ سب آدمی انہیں بڑے آدمی کی بیوی اور بہو سمجھتے تھے۔ کوئی یہ نہیں سمجھتا تھا کہ بھابی جان کا تعلق اب بڑے لوگوں سے صرف چھوٹے لوگوں کی وجہ سے رہ گیا ہے۔ وہ بڑے لوگوں کے پاس صرف سفارشیں لے کر جاتی ہیں ورنہ بڑے لوگوں سے اب انہیں دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔ بھابی کالج جاتیں اور وہاں بھی پڑھانے کے علاوہ ہر لڑکے کے معاملات میں دلچسپی لیا کرتیں۔ کالج سے آکر پابندی کے ساتھ کئی کئی خط روز لکھتیں اور انہیں ڈاک میں ڈلواتیں۔ عام طور پر یہ خطوط نئے لکھنے والوں کے نام ہوتے تھے، جو ہر روز انہیں خط لکھا کرتے تھے۔ بھابی نے محض دل بہلانے اور وقت کاٹنے کے لئے لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر وہ بہت اچھا لکھنے لگی تھیں۔ اور نئے لکھنے والے ان سے مشورے طلب کرتے اور وہ بڑی محبت کے ساتھ ان کے خطوں کا جواب دیا کرتیں، اس طرح کہ نئے لکھنے والے نہ تو غلط فہمیوں کا شکار ہو کر بھٹک جائیں اور نہ ان کی دل شکنی ہو۔ پھر وہ شام کو ایک جگہ ٹیوشن پڑھانے چلی جایا کرتی تھیں۔

یعنی صبح جاگنے کے بعد سے سوتے وقت تک کام آدمی کا ہے مشین معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے خط لکھنے کے شوق سے تنگ آکر میں نے کہا۔

'بھابی آپ نے کیا علت پال رکھی ہے۔ کالج میں تو سر کھپاتی ہی ہیں، گھر پر بھی ایک کالج بنا رکھا ہے۔'

بھابی بڑے باوقار انداز میں مسکرائیں اور بولیں۔۔۔

''اختر! ان نئے لکھنے والوں کو کیسے بھول سکتی ہوں۔ یہ تو ہمارے مستقبل کی امیدیں ہیں۔ اگر میں ان پودوں پر روز چھڑکاؤ نہیں کرسکتی، ان کی خدمت نہیں کرسکتی کہ ان میں پھول لگیں اور سارا باغ مہک اٹھے، تو کم سے کم جو کچھ کرسکتی ہوں، وہ تو کرنا چاہئے۔'

اس جواب کے بعد کچھ اور بولنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔۔ میں چپ ہو رہا۔ ایک دن شام کے وقت وہی لڑکی شمی ان کے پاس آئی۔ وہ بہت اداس تھی وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن پھر بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ بار بار اس کے ہونٹ کانپ کر رہ جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ رو دے گی۔ بھابی نے حسب عادت اسے بٹھایا اور باتیں کیں۔ پھر آنے کی وجہ پوچھی تو وہ کچھ بھی نہ بولی۔ بھابی جتنے اصرار کے ساتھ پوچھتیں۔ معلوم ہوتا کہ اس کے ہونٹ اتنی ہی شدت کے ساتھ آپس میں چپکتے جاتے تھے۔ آخر وہ کچھ نہ بول سکی تو بھابی نے اسے پکڑا اور سونے کے کمرے میں لے گئیں۔ دروازہ اندر سے بند کیا اور پوچھا کہ کیا بات ہے؟ لیکن شمی کچھ بتانے کے بدلے رونے لگی اور بھابی کے چپ کرانے پر بھی روتی گئی اور بڑی دیر کے بعد بھابی کے ڈانٹنے پر اس نے بتایا کہ دوسرے ہی دن اس کے بھائی کے ایم اے کی فیس داخل کرنی ہے اور روپے کا انتظام نہیں ہو سکا ہے۔ اب وہ اس بات پر شرمندہ تھی کہ بھابی اس کے کالج کا خرچ دیتی ہیں، اب وہ بھائی کے لئے فیس مانگے۔ لیکن دوسرا کوئی اور ایسا ہمدرد بھی نہ تھا، جس کے سامنے وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی اور وہ صرف اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ان کے پاس آئی تھی۔

بھابی نے بڑی محبت سے شمی کے گال پر ایک چپت لگائی اور بولیں۔۔

'پگلی! اس میں رونے کی کیا بات تھی۔ آخر اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ ہم لوگ اسی طرح تو ایک دوسرے سے کہہ کر اپنا دکھ درد ہلکا کر سکتے ہیں۔'

یہ کہہ کر انہوں نے الماری کھولی اور چھوٹی چھوٹی سونے کی دو چوڑیاں لا کر شمی کے ہاتھ پر رکھ کر بولیں۔۔

'لے جاؤ اسے بیچ کر تمہارا بھائی فیس ادا کر سکے گا۔'

شمی شاید گر جاتی لیکن بھابی نے اسے سنبھال لیا اور اس کی پیشانی چوم لی اور بولیں۔۔ 'شمی! سدا ایسا ہی زمانہ نہیں رہے گا۔ دن بدلیں گے۔ جاؤ، سویرے چلی جاؤ، پھر اندھیرا ہو جائے گا۔'

شمی چوڑیوں کو لے کر چلی گئی۔ یہ چوڑیاں وہ تھیں، جو دو دن پہلے بھابی جان نے ننھی ریحانہ کے لئے بڑی مشکل سے پیسے بچا کر بنوائی تھیں اور جسے ریحانہ نے صرف ایک بار پہنا تھا۔

چوڑیاں دے کر بھابی جان بہت خوش تھیں۔ جیسے ان کے دل سے پہاڑ جیسا کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔

میں چار دنوں سے ان کے پاس تھا اور ایک ضروری کام کے سلسلے میں ان سے مشورہ کرنے آیا تھا۔ لیکن ان کی مصروفیتیں اور پریشانیاں دیکھ کر نہ موقع ملا اور نہ ہمت ہو سکی اور میں نے سوچ لیا کہ بھابی سے بغیر کوئی مشورہ کیے اور مدد مانگے واپس جاؤں گا۔ حالاں کہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ صرف وہی ایسی آدمی تھیں جو اس سلسلہ میں میری مدد کر سکتی تھیں۔ لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ ان سے ہرگز نہیں کہوں گا۔

آخر بھابی نے خود ہی کہا۔ 'تم چار دنوں سے آئے ہو، لیکن کوئی بات تک نہیں کی۔'

میں نے کہہ دیا۔ 'میں صرف ٹہلنے اور آپ سے ملنے آ گیا تھا بھابی۔'

پھر وہ بولیں۔ 'اور تمہاری شادی کا کیا ہوا؟ سنا ہے تم میں اور تمہارے گھر والوں میں شادی کے مسئلے پر سخت اختلاف ہو گیا ہے۔'

'جی ہاں — شادی کرنے کا مطلب ہے کہ یا تو میں امی کی پسند کے مطابق ایک احمق لڑکی سے شادی کر لوں یا پھر چپ بیٹھا رہوں۔'

'اور وہ جمیلہ! تم تو جمیلہ سے شادی کرنا چاہتے تھے نا۔' بھابی بولیں۔

'اب بھی چاہتا ہوں۔ لیکن امی نے کہہ دیا ہے کہ جمیلہ اس گھر میں بہو بن کر داخل نہیں ہو سکتی۔' میں نے کہا۔

'یہ تو بڑا ظلم ہے۔'

'ہے تو لیکن کیا کیا جائے۔ بہت سے ظلم برداشت کرنے پڑتے ہیں۔'

'تو اپنی امی کی پسند سے شادی کر لو پھر۔'

'یہ بھی نہیں کر سکتا بھابی۔'

'پھر کیا سوچا؟'

'شادی تو جمیلہ سے ہی کروں گا اور گھر چھوڑ دوں گا۔' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

'تو پھر بسم اللہ۔ بیاہ کر لے آؤ۔ یہاں میرے ساتھ رہے گی۔ میں بھی اکیلی ہوں۔'

اُف — بھابی کے یہ جملے سن کر میرا سر چکرا گیا۔ یہ عورت ہے یا عزم و ہمت کا ستون۔ ہر روز ایک نیا بوجھ

اپنے لئے بڑھائے جاتی ہیں۔ خود اپنی ضرورتیں اور ذمہ داریاں کیا کم ہیں، مگر ہمت ہے۔۔ اور صرف ہمت کے سہارے شوہر کی دوری اور نظر بندی کا غم ہنس ہنس کر بھلائے جاتی ہیں۔ میں نے سوچ سمجھ کر جواب دیا۔

'میں بھی یہی سوچ رہا تھا لیکن ابھی دیر ہوگی بھابی۔ جمیلہ بیمار ہے ابھی۔'

جمیلہ بیمار نہیں تھی، بالکل اچھی تھی۔ لیکن اگر میں یہ نہیں کہتا تو وہ پھر ضد پر آجاتیں۔ حالاں کہ حقیقت یہ تھی کہ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ بھابی سے مشورہ کرنے کے بعد ہی جمیلہ سے شادی کرلوں گا اور اسے ان کے پاس رکھ کر کہیں تلاش روزگار میں نکلوں گا۔

بھابی جمیلہ کی بیماری کی خبر سن کر بہت افسوس کرنے لگیں اور بولیں۔

'سچ مچ جمیلہ بڑی پیاری لڑکی ہے۔'

پھر میں باہر چلا گیا اور سوچا کہ رات کی گاڑی سے چلا جاؤں گا۔ چار بجے واپس آیا تو دیکھا کہ بھابی جان بہت اداس بیٹھی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک تار ہے جس کو وہ ہاتھ میں لیے ہوئے بس دیکھتی جارہی ہیں۔ ان کے چہرے کا گورا رنگ بالکل سنولایا ہوا تھا۔ میں چپ چاپ ان کے پاس جاکر بیٹھ گیا اور پوچھا۔۔

'تار کیسا ہے بھابی جان؟'

'اختر۔۔'

بھابی جان نے تار میرے ہاتھ میں دے دیا اور میز پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگیں۔

میں نے تار پڑھا۔ بھائی جان کو چار سال کی سزا ہوگئی تھی۔ میں نے کچھ دیر کے بعد بمشکل کہا۔

'بھابی جان صبر کیجیے۔ ابھی تو آپ کو ایسے امتحانوں کی منزل سے اور بھی گزرنا باقی ہے۔'

اور بھابی کو جیسے سکون آگیا۔ وہ اٹھ بیٹھیں اور بولیں۔۔

'ٹھیک کہتے ہو اختر۔ میں اگر پریشان ہوئی تو بچے اور پریشان ہوں گے۔'

اتنا کہہ کر وہ اٹھیں اور منہ ہاتھ دھونے چلی گئیں۔ جب واپس آئیں تو معلوم ہوتا تھا کہ بس ایک لہر تھی جو آئی اور گزر گئی۔ لیکن ہم لوگ جتنی دیر تک چائے پیتے رہے، بھابی کی نظر بار بار پرانے سنگار میز پر رکھی بھائی جان کی تصویر کا طواف کرتی رہی۔ اسی وقت انہوں نے بتایا کہ ان کے پاسپورٹ کی درخواست نامنظور ہوگئی ہے اور اسی

رات انہیں دہلی جانا بہت ضروری ہے۔

اسی رات بھابی جان دہلی چلی گئیں۔۔۔ اور میں بھی واپس ہوگیا۔ رات کے سناٹے میں ریل گزرتی جارہی تھی اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اندھیری رات میں بھابی جان مجھے روشنی دکھا رہی تھیں۔ ریل تیزی کے ساتھ گزرتی جارہی تھی اور میرے دل میں نئے ارادے، نئے حوصلے پیدا ہورہے تھے۔ نئی امیدیں اور نئی امنگیں جاگ رہی تھیں۔

لفظ و معنی

کلیسا	۔	گرجا، عیسائیوں کی عبادت گاہ
احتجاج	۔	اعتراض، حجت، انکار
ملازمت	۔	نوکری، خدمت میں رہنا
سراپا	۔	سر سے پاؤں تک کی تصویر کشی
نجات	۔	رہائی، چھٹکارا
صلیب	۔	عیسائیوں کا مقدس نشان
جبر	۔	ظلم، ستم
ملازم	۔	نوکر، خادم
ستون	۔	کھمبا
عزم	۔	ارادہ، نیت، جمع عزائم

آپ نے پڑھا

- سہیل عظیم آبادی کی کہانی 'بھابی جان' میں آپ نے رقیہ بھابی کے روپ میں عورت کے ایک ایسے کردار کے بارے میں پڑھا جو مہر و وفا اور ایثار و قربانی کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی جاتی ہے، رقیہ بھابی ہمارے دلوں میں اپنا ایک مستحکم مقام بناتی جاتی ہیں۔ دراصل کہانی میں ان کی پوری شخصیت ایک شمع کی طرح قارئین کے سامنے آتی ہے، شمع جو خود جلتی اور پگھلتی رہتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کا وجود ختم ہوجاتا ہے۔ لیکن اس کی روشنی سے نہ جانے کتنے تاریک ذہن منور ہوتے رہتے ہیں۔

- رقیہ بھابی پر گھر کی تمام ذمہ داریاں تھیں، بچوں کی تعلیم وقت پر ان کے کھانے پینے کا انتظام، اپنے دیور کی خاطر داری، رقیہ بھابی ہمیشہ مالی دشواریوں سے دوچار رہتی تھیں۔ اس لئے کہ وہ جس کالج میں لکچرر تھیں وہاں سے ان کو صرف چار سو روپئے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ بھابی ایک لڑکی کو ٹیوشن بھی پڑھاتی تھیں اس سے پچاس روپئے مل جاتے تھے۔ لے دے کر یہی ان کی کل آمدنی تھی اور خرچ بہت زیادہ...... ان کے شوہر کو سیاست کا شوق تھا جس کی وجہ سے انہیں بار بار جیل جانا پڑتا تھا۔
- رقیہ بھابی نے تمام باتوں کے باوجود کبھی اپنے شوہر کا حوصلہ پست نہیں ہونے دیا اور تنہا سارا غم جھیلتی رہیں۔ انہوں نے غموں کے درمیان خوش رہنا سیکھ لیا تھا۔ وہ ایک انتہائی ہمدرد اور مخلص عورت تھیں۔ غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ غریب بچیوں کی تعلیم اور ان کی شادی وغیرہ کے موقع پر بھی وہ مدد کرنے سے باز نہیں آتی تھیں۔ دوسری طرف ان کے شوہر کو سیاسی سرگرمیوں میں پیش پیش رہنے کی وجہ سے زیادہ تر جیل میں ہی رہنا پڑتا تھا اگر کبھی کچھ دنوں کے لئے رہائی بھی ہوتی تھی تو پھر کسی دوسرے مقدمے میں جلد ہی سزا ہو جاتی تھی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود رقیہ بھابی نے کبھی خود کو مجبور اور بے سہارا نہیں محسوس کیا اور اپنے نامساعد حالت کے باوجود ہمیشہ دوسروں کو حوصلہ اور سہارا دیتی رہیں۔
- سہیل عظیم آبادی کی یہ کہانی زبان، اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے ایک کامیاب اور عمدہ کہانی ہے۔ اس کا موضوع نیا نہیں ہے بلکہ بہت پرانا اور عام موضوع ہے پھر بھی کہانی پڑھنے والوں کو ایک نیا عزم اور حوصلہ دیتی ہے۔ ساتھ ہی یہ سبق بھی کہ انسان اگر چاہے تو دشواریوں اور پریشانیوں کے درمیان بھی اپنے لئے جینے کی راہ نکال سکتا ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. سہیل عظیم آبادی کہاں پیدا ہوئے تھے؟
2. سہیل عظیم آبادی کے بچپن کا نام کیا تھا؟
3. سہیل عظیم آبادی کے افسانوں کے پہلے مجموعہ کا نام کیا تھا اور وہ کس سال شائع ہوا تھا؟
4. سہیل عظیم آبادی کی ابتدائی تعلیم کس مدرسے میں ہوئی تھی؟

مختصر سوالات

1. رقیہ بھابی کے جس دیور کا کردار کہانی میں پیش کیا گیا ہے اس کا نام کیا تھا؟
2. رقیہ بھابی کے شوہر کو بار بار کیوں جیل جانا پڑتا تھا؟
3. رقیہ بھابی کس لڑکی کی تعلیم کا خرچ خود برداشت کرتی تھیں اور کیوں؟
4. رقیہ بھابی کو سونے کی چوڑیوں کو کیوں فروخت کروانا پڑا تھا؟
5. رقیہ بھابی کو جب فرصت ملتی تھی تو وہ اپنا شوق پورا کرنے کے لئے کون سا کام کیا کرتی تھی؟

طویل سوالات

1. رقیہ بھابی کا سراپا کم از کم دس جملوں میں تحریر کریں۔
2. رقیہ بھابی کے کردار کو ایک مثالی کردار بنا کر سہیل عظیم آبادی نے قاری کو حوصلہ دینے کا کام کیا ہے، اس خیال سے آپ کس حد تک اتفاق کرتے ہیں؟
3. سہیل عظیم آبادی اردو کے کس افسانہ نگار سے بہت زیادہ متاثر تھے اور کیوں؟
4. افسانہ بھابی کے کس کردار نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا اور کیوں؟
5. سہیل عظیم آبادی کے بارے میں اپنے اردو کے استاد سے مدد لے کر کم از کم دس جملے تحریر کریں، ساتھ ہی یہ بھی تحریر کریں کہ ان کے افسانوں کے دوسرے مجموعہ کا نام کیا تھا اور وہ کب شائع ہوا تھا؟

آیئے، کچھ کریں

1. بہار کے چند اہم افسانہ نگاروں کے ناموں کی ایک فہرست بنایئے۔
2. اگر آپ کی نگاہ میں رقیہ بھابی جیسا کوئی دوسرا کردار ہو تو اس کا تعارف تحریر کریں۔

سید محمد محسن

سید محمد محسن کا شمار اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے، وہ نفسیات کے پروفیسر تھے اور نفسیات ان کا خاص موضوع تھا۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ 'انوکھی مسکراہٹ' اردو دنیا میں کافی مقبول و معروف ہوا۔ اس مجموعے کی بیشتر کہانیاں نفسیاتی نوعیت کی ہیں۔ خاص طور پر 'انوکھی مسکراہٹ' ڈاکٹر محمد محسن کی ایک ایسی کہانی ہے جس کے ذکر کے بغیر اردو افسانے کی تاریخ شاید مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر محمد محسن کی پیدائش 10/جولائی 1910ء کو پٹنہ میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سید محمد رشید تھا۔ محسن صاحب نے 1926ء میں رام موہن رائے سیمنری پٹنہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1928ء میں پٹنہ کالج سے آئی اے، 1931ء میں نفسیات کے ساتھ بی اے آنرس کا امتحان پاس کیا اور 1934ء میں نفسیات میں ہی پٹنہ یونی ورسٹی سے ایم اے فرسٹ کلاس سے پاس کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ 1938ء میں وہ پٹنہ کالج میں شعبہ فلسفہ میں عارضی طور پر لکچرر بحال ہوئے پھر 1948ء میں پٹنہ یونی ورسٹی کے شعبہ نفسیات میں مستقل طور پر لکچرر بحال ہوئے۔ 1953ء میں وہ شعبہ نفسیات میں صدر شعبہ نفسیات مقرر ہوئے اور 1974ء میں وہ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

ان کی کتابوں میں 'انوکھی مسکراہٹ' افسانوں کا مجموعہ 'نفسیاتی زاویے' نفسیاتی مضامین کا مجموعہ 'زخم کے پھول' شعری مجموعہ بہت اہم ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی دوسری کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔

سید محمد محسن کو تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں، آپ نے 1973ء میں اپنی اہلیہ کے ساتھ حج کا فریضہ بھی ادا کیا تھا۔

سید محمد محسن کی وفات 2002ء میں علاج کے دوران دہلی میں ہوئی۔

ABDEL SOLUTIONS
ABSOL
PATNA

فرار

'محمود' ماں کی کرخت آواز محمود کے کان میں گونج گئی۔ وہ بازو کے کمرہ میں حساب بنا رہا تھا۔ حساب کی کاپی سمیٹے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا نام خطرہ کی گھنٹی کی طرح اس کے کان میں بج رہا تھا۔ وہ بھاگا ہوا ماں کے پاس آیا۔ اس کی ماں کا فربہ جسم غصہ سے کانپ رہا تھا۔ جیسے تند ہوا میں برگد کا درخت ڈول رہا ہو۔ ماں کی ابھری ہوئی آنکھیں، لال انگارہ سا چہرہ، پھیلی ہوئی گردن دیکھ کر سہم گیا گو یہ منظر اس کے لئے نیا نہیں تھا۔ معصوم فرشتہ کی طرح نظریں نیچی کئے محمود ماں کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ یہ منفعلانہ انداز آنے والی آفت کے مقابلہ میں اس کا تنہا ہتھیار تھا۔

'بلا انہیں باہر سے۔' محمود کی ماں نے گرجتے ہوئے کہا۔

'آپ کو بلا رہی ہیں۔' محمود نے رکتے رکتے کہا۔

'مجھ سے کیا کام ہے؟ غصہ میں ہیں تو ہوا کریں، انہیں تو ہر وقت غصہ ہی چڑھا رہتا ہے۔'

'اچھا چلو، آتا ہوں۔' اس کے باپ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کمزور آواز میں کہا۔

محمود کے باپ کو دیکھ کر اس کی ماں اور بلند آواز میں گرجنے لگی۔

'تم نے میری مٹی پلید کر ڈالی۔ نوج اس دن کو جب میرے باپ نے تمہارے ساتھ میری شادی کی۔'

'آخر کچھ کہو گی بھی یا یونہی بکے جاؤ گی؟' محمود کے باپ نے آہستگی سے سوال کیا۔

'ہاں، ہاں! میں تو بکواس مچاتی ہی ہوں۔ پاگل سری سب کچھ ہوں۔'

'ارے بھائی میں کب کو تمہیں پاگل کہہ رہا ہوں۔ اپنے منہ جو چاہو کہہ لو۔'

'ہاں جی تم سا شریف دنیا میں کون ہوگا۔ جانے دو میں رذیل سہی، کمینی سہی۔ لیکن تمہارے گھر میں اب ایک منٹ میرا قدم نہیں جم سکتا۔'

'ارے بھائی خدا کا واسطہ کچھ بتاؤ بھی تو۔'

'اہا، کیسے بھولے ہیں آپ۔ گویا کچھ جانتے ہی نہیں۔ بیٹھے بیٹھے سارا فساد مچاتے رہتے ہیں اور اوپر سے دیکھو تو جیسے موم کی گڑیا۔ میں نے تمھیں ہزار بار منع کیا ہے کہ اس موئے وکیل کے یہاں نہ جایا کرو۔ لیکن تم کہاں ماننے والے اس کی جورو تو ڈائن بن کر مجھے نگلنے کی فکر میں ہے اور تم اس سے گھل مل کر میٹھی میٹھی باتیں کیا کرو۔'

'ارے بھئی، آہستہ بولو۔ محلہ والے سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ تمھیں تو خواہ مخواہ شک پیدا ہو جاتا ہے۔'

محمود کی ماں نے اور چیخ چیخ کر بولنا شروع کیا۔ ہزاروں گالیاں وکیل کو دیں۔ سیکڑوں صلواتیں محمود کے باپ کو سنائیں۔

محمود اپنی عمر کے دسویں ہی سال میں یتیم ہو گیا اور باپ کے مرنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کی ماں بھی اسے چھوڑ گئی۔ قسمت نے اسے اس کے عسرت زدہ ماموں کے مکان میں منتقل کر دیا۔ زندگی کی دشواریاں اس کے لئے ایک نامہر لیکن عاقبت اندیش استاد بن گئیں۔ ماحول کی ناسازگاریاں اسے جتنی زیادہ ٹھوکر لگاتیں اس کے اندر استواری اور استقامت کی کوششیں اتنا ہی زیادہ تیز ہوتی جاتیں۔ اس صغرسنی میں بھی وہ مستقل مزاجی اور پختگی عزم کا ایک مکمل نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس کا بچپن، طفولیت اور شباب کے درمیانی مراحل پھاند کر انسانی تعمیر کی آخری منزل تک پہونچ گیا ہو۔

محمود یونی ورسٹی کے ہوسٹل میں رہتا تھا جہاں اس کی تنہائی پسندی اور رہبانیت کا اس کے ساتھی برابر مذاق اڑایا کرتے تھے۔ یونی ورسٹی کی فضا کو۔ایجوکیشن (لڑکے اور لڑکیوں کی یکجا تعلیم) کی وجہ سے گہری رومانی ہو گئی تھی۔

محمود کے ساتھی کمال جادو بیانی اور گرم جوشی کے ساتھ ان فردوسی مناظر کی تصویریں اس کے آگے کھینچتے۔ محمود کی طبیعت میں بھی گدگدی سی پیدا ہو جاتی۔

'یار تمہارے سینہ میں دل نہیں لکڑی کا ٹکڑا ہے جس پر بجلی تک کا اثر نہیں ہوتا۔ کل کلاس میں خالدہ کس طرح نظریں بچا بچا کر تمھیں تک رہی تھی۔ کاش وہ اس طرح مجھے دیکھتی ہوتی۔ یقین مانو میں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہوتا۔' عظیم نے اپنے خاص پر جوش انداز میں کہا۔

'خیر مذاق وغیرہ ختم کرو بے چاری معصوم لڑکی پر جو تم اس قسم کی تہمت لگاتے ہو۔ یہ تو بہت نامناسب بات ہے۔'

'تہمت کیسی؟ ہم انہیں گھورتے رہتے ہیں اور وہ بے چاریاں ہمیں تکنے سے بھی رہیں۔ اور بھئی تمہیں تو اپنا مول معلوم نہیں۔ کاش میرے اندر تمہاری شکل وصورت ہوتی۔ میری زندگی ایک مستقل رومان ہوتی رومان' عظیم نے سینہ تانتے ہوئے کہا۔ 'آج شام کو نمائش آؤ تو تمہیں دکھلادوں کہ یاران نکتہ داں کے لئے کیسی صلائے عام ہے۔'

'میں تمہارے کہنے پر آج شام کو نمائش جاؤں گا۔ پھر وہاں سے کسی ریستوراں میں چلنا۔ لیتے آنا اپنی کسی مہ پارہ کو وہ بھی میری استقامت آزمالے گی۔'

'واقعی چلوگے یا صرف۔ آن میں بول رہے ہو؟' عظیم نے محمود کے چہرہ پر نظریں جماتے ہوئے سوال کیا۔

'محمود کسی دعوے کے بعد قدم پیچھے ہٹانا جانتا ہی نہیں' محمود نے فاتحانہ انداز میں جواب دیا۔

عظیم تو محمود سے وعدہ لے کر چلا گیا۔ لیکن محمود ایک عجیب تاثراتی کشاکش میں مبتلا ہو گیا۔ جیسے کوئی کسی گناہ کے ارتکاب کا ارادہ کر کے پچھتانے لگا ہو اور نتائج کے موہوم لیکن ہوش ربا تصورات وکیفیات کے سانچہ میں ڈھل کر اس کی روح میں پیوست ہو رہے ہوں۔ محمود کی انگلیاں غیر اضطراری طور پر رہ رہ کر اس کی نبض ٹٹولنے لگتیں جیسے اسے بخار کا احساس ہو رہا ہو۔ اس کے دل میں ایک غیر معمولی وحشت ناک دیوانگی کی کیفیت محسوس ہو رہی تھی جیسے کوئی رات کے سناٹے میں کھلے میدان سے خوف کھانے لگتا ہو۔ اس غیر معمولی اضمحلال اور خستگی کا کوئی سبب محمود کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

وہ ہاسٹل سے باہر نکلا اور قدم تیز کرتا ہوا نمائش کو روانہ ہوا۔ کافی دور پہونچ چکنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ غلط راستہ پر لگ گیا ہے۔ اسے اپنی اس بھول پر حیرت سی ہو رہی تھی۔ اس کے پاؤں سرد ہو گئے اور وہ دیر تک اسی جگہ مبہوت کھڑا رہا جیسے اسے سکتہ سا ہو گیا ہو۔ 'اب نمائش جانا بالکل بے سود ہے۔' اس نے کہا۔ 'عظیم انتظار کر کے کہیں اور جا چکا ہوگا' وہ اپنے کمرہ کی طرف لوٹ آیا اور کرسی پر بیٹھ کر اپنی اس خود فراموشی کا جائزہ لینے لگا۔

آخر اسے ہو کیا گیا تھا؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔

اپنی خود اعتمادی پر یہ کاری ضرب کئی دنوں تک محمود کے دماغ میں الجھنیں پیدا کرتی رہی گو عظیم سے اس نے طبیعت کی خرابی کا عذر پیش کر دیا تھا جسے عظیم نے 'بہانہ سازی' کہہ کر ٹال بھی دیا۔

یونی ورسٹی کی تعلیم کے بعد مقابلہ کے امتحان میں شامل ہوا اور اسے ڈپٹی کلکٹری مل گئی۔ نسبتیں اس کی تعلیم کے وقت ہی سے آتی تھیں۔ اب بڑے بڑے گھرانوں سے پیام آنے لگے۔

ایک دن محمود گھر سے واپس آیا تو گھر کی ویرانی اسے کاٹتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ اسے اپنی زندگی حیات کی ایک بے روح نقل نظر آنے لگی۔ گھر کے سناٹے میں دیوار سے لگی ٹک ٹک کرتی ہوئی گھڑی ان کے دماغ پر ٹھوکریں سی مارنے لگی، گھڑی کا پنڈولم اسے اپنی ذات کا مرقع معلوم ہونے لگا۔ ویسا ہی ایک طریقہ اور ایک رنگ پر حرکت کرتا ہوا وہ کب تک مشین کے پرزوں کی طرح زندگی گزارتا رہے گا۔

اس نے سوچا اور فیصلہ کرلیا کہ وہ بہت جلد شادی کر کے زندگی کی کیف سامانیوں سے ہم کنار ہوکر رہے گا۔ اسی شام کو اس نے اپنی ساری پچھلی نسبتوں پر نئے سرے سے غور کرنا شروع کر دیا۔ اکثر و بیشتر کے متعلق اسے علم تھا کہ وہاں اب اس کے لئے جگہ خالی نہ رہی تھی۔ باقی ماندہ چند نسبتوں میں اسے ایک ہر اعتبار سے قابل اعتنا معلوم ہوئی۔ صرف لڑکی کی تعلیم نامکمل تھی، لیکن لڑکی کا سن زیادہ نہ تھا اس لئے یہ خامی دور کی جاسکتی تھی۔ محمود نے اس نسبت کی ازسرنو چھیڑ چھاڑ کرائی۔ بات پختہ ہوگئی اور عقد بھی جلدی ہوگیا۔ لیکن رخصتی لڑکی کے میٹریکولیشن پاس کرنے تک ملتوی رکھی گئی۔

امتحان کا نتیجہ زبیدہ کی خاطر خواہ کامیابی کا مژدہ لایا۔ محمود خوشی سے دیوانہ ہوگیا۔ اس کے خواب اب حقیقت بننے والے تھے۔ وہ اس خیال کی لذت سے سرشار ہو رہا تھا۔

دوسرے ہی دن سے محمود اپنی شادی کی تیاری میں منہمک ہوگیا۔ اس نے دفتر سے ڈھائی ماہ کی مسلسل فرصت لے لی۔ شادی کے اخراجات پر اس نے کثیر رقم خرچ کی۔ شہر کے سارے معززین کو بارات کی شرکت کی دعوت دی۔

لیکن سسرال میں قدم رکھنے کے بعد اس کے اندر ایک عجیب حیرت انگیز تغیر پیدا ہونے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں بے نور اور متوحش سی دکھائی دینے لگی تھیں۔ اس کا جسم برف کی طرح سرد ہوتا جارہا تھا اور چہرہ کی سرخی رفتہ رفتہ پھیکی پڑتی جارہی تھی جیسے کوئی دور سے ایک بھیانک منظر دیکھ رہا ہو۔

باہر کے لوازمات کے بعد جب محمود کو زنانہ مکان کے اندر لے جایا جانے لگا تو اس کے پاؤں میں

لڑکھڑاہٹ پیدا ہوگئی اور اس کے سارے جسم میں ایک ہیبت ناک تھرتھراہٹ، جیسے اسے شدت کا جاڑا لگ رہا ہو۔ آگے قدم بڑھانا اس کے لئے ناممکن ہوگیا۔ عورتوں میں محمود کی اس کیفیت پر ہلچل سی مچ گئی اس کے سسر کو اطلاع دی گئی۔ وہ بھاگا ہوا محمود کے قریب آیا۔ مزاج پرسی کی، طبیعت کا حال دریافت کیا۔ لیکن محمود کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ جیسے وہ دفعتاً گونگا ہوگیا یا اس نے ابھی بولنا سیکھا ہی نہ ہو!

لفظ و معنی

کرخت ۔ سخت

فربہ ۔ موٹا

تند ۔ تیز

برگد ۔ بڑ (ایک درخت کا نام)

انگارہ ۔ آگ کا شعلہ، تودہ

روبرو ۔ آمنے سامنے

منفعلانہ ۔ شرمندگی کے ساتھ

مٹی پلید کرنا ۔ عزت برباد کردینا

عسرت زدہ ۔ معاشی تنگی کا شکار

عاقبت اندیش ۔ دور تک نتائج کو دیکھنے والا

نامہر ۔ بے وفا

ناسازگار ۔ ناموافق

استواری ۔ مضبوطی

استقامت ۔ ٹھہراؤ، پختگی

صغرسنی ۔ بچپن کی عمر

عزم ۔ ارادہ

طفولیت - بچپن

شباب - جوانی

رہبانیت - دنیا کو چھوڑ کر زندگی گزارنا

ریستوراں - ہوٹل

کشاکش - کشمکش

موہوم - دھندلا

اضمحلال - کمزوری، تھکاوٹ

آپ نے پڑھا

- اس افسانے میں ایک نوجوان مرد (محمود) کا کردار سامنے آتا ہے جو حصول تعلیم کے لئے سرگرداں رہتا ہے اور عام نوجوانوں کے برخلاف ہوسٹل میں ایک ایسی مثالی زندگی گزارنا چاہتا ہے جو ایک اچھے طالب علم کی پہچان ہوتی ہے لیکن ساتھیوں کے اکسانے پر وہ تفریح کی طرف مائل ہو جاتا ہے لیکن وہ ایک نفسیاتی الجھن کا بہر حال شکار رہتا ہے۔ بچپن میں اپنے گھر میں ماں کی سخت مزاجی، شدت پسندی اور باپ پر بے جا حکمرانی کا منظر نامہ اسے لاشعوری طور پر عورت سے متوحش اور متنفر کر دیتا ہے۔ اس نفسیاتی کیفیت میں حصول تعلیم کے بعد اور اچھی ملازمت میں داخل ہونے کے بعد جب وہ شادی کی پہلی رات سسرال میں زنان خانہ کے اندر داخل ہوتا ہے تو اسے اپنے گھر کا وہ گھٹن بھرا ماحول نظر آنے لگتا ہے جہاں عورت غلط انداز میں مرد کو دباتی اور اس کی تذلیل کرتی ہے۔ اس نفسیاتی نکتے نے اسے ازدواجی فرائض سے خوفزدہ کر دیا اور اس کی شخصیت کو نامکمل بنا دیا۔

مختصر ترین سوالات

1. ڈاکٹر محمد محسن کی پیدائش کس شہر میں ہوئی تھی؟
2. ڈاکٹر محمد محسن کی تاریخ پیدائش بتایئے۔
3. زیر نصاب افسانوں میں ڈاکٹر محمد محسن کا کون سا افسانہ ہے؟
4. ڈاکٹر محمد محسن کے والد کا نام بتایئے۔
5. ڈاکٹر محمد محسن کس موضوع پر مہارت رکھتے تھے۔

مختصر سوالات

1. ڈاکٹر محمد محسن کی تدریسی سرگرمیوں پر پانچ جملے لکھیے۔
2. ڈاکٹر محمد محسن کی تصنیفات کا ذکر کیجیے۔
3. محمود کے کردار پر پانچ جملے لکھیے۔

طویل سوالات

1. ڈاکٹر محمد محسن کی افسانہ نگاری پر ایک مضمون لکھیے۔
2. افسانہ 'فرار' کا مرکزی خیال بیان کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. اردو میں نفسیاتی افسانوں کے بارے میں اپنے استاد سے معلومات حاصل کیجیے۔
2. اپنے کلاس میں افسانے کے آغاز و ارتقاء پر ایک مذاکرہ کیجیے۔

قمر جہاں

قمر جہاں کی پیدائش تقریباً 52-1951 میں سستی پور ضلع کے مردم خیز گاؤں بزرگ دوار میں ہوئی۔ اسی گاؤں کو ان کا آبائی وطن سمجھنا چاہئے۔ آپ کے والد کا نام سید عطاء الحق تھا۔ خاندان کے افراد علم و ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ روایتی تعلیم حاصل کرنے کے بعد قمر جہاں پٹنہ آگئیں اور پٹنہ یونی ورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ اردو ادب سے فطری دلچسپی ہونے کی وجہ سے زمانہ طالب علمی میں ہی یعنی 1966ء سے افسانہ لکھنا شروع کر دیا۔ آپ کی پہلی کہانی 'جنون وفا' ہے، جو ماہنامہ 'صبح نو' پٹنہ سے 1966ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔

سندروتی مہیلا کالج، بھاگل پور کے شعبہ اردو سے آپ نے اپنے تدریسی کیریر کا آغاز کیا اور ترقی کر کے بھاگل پور یونی ورسٹی کے صدر شعبہ اردو تک کے عہدہ کو سنبھالا۔ افسانہ نگاری کے علاوہ آپ کے متعدد تنقیدی مضامین کے مجموعے بھی شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ تدریسی خدمات و تصنیفی مصروفیات ایک ساتھ جاری ہیں۔

قمر جہاں کی تصانیف میں تین افسانوی مجموعے ہیں جن میں 'چارہ گر' (1983ء)، اور 'اجنبی چہرے' (1991ء) شائع ہو چکے ہیں۔ اور ایک افسانوی مجموعہ 'یادنگر' زیر اشاعت ہے۔ 'اختر شیرانی کی جنسی و رومانی شاعری'، 'معیار'، 'کلام عبداللہ حافظ مشکی پوری' (تحقیق و تدوین کلام) اور 'حرف آگہی' آپ کی تنقیدی تصانیف ہیں۔ قلمی سفر ابھی جاری ہے۔

کٹی ہوئی شاخ

کتنے سال بعد وہ اپنے وطن واپس آیا تھا۔ ہر چیز نئی نئی اور قدرے اچھوتی اچھوتی سی معلوم ہو رہی تھی۔ ایک مدت تک باہر رہ جانے کے باعث اب وہ خود اپنے وطن کے لئے اجنبی سا ہو گیا تھا مگر اس اجنبی پن میں بھی اپنے پن کا احساس پنہاں تھا۔ وہ دیر سے خود اپنے آپ سے سوال کر رہا ہے۔

کیا وہ سچ میں اجنبی ہو گیا ہے؟ شکل و شباہت، لباس اور کچھ حد تک گفتگو میں وہ بدل گیا ہے۔ لیکن اس کا باطن......؟ اندرون میں ایک عجب توڑ پھوڑ مچی ہوئی ہے، آخر وہ اپنے آپ کو اتنا بے بس کیوں محسوس کر رہا ہے؟

بار بار اس کا ذہن کسی ایک سوال کے گرد مکڑی کے جالے کی طرح گھوم رہا ہے۔

'آخر وہ اتنی اچھی سرزمین اور ایسے دلدار لوگوں کو چھوڑ کر کیوں اتنے لمبے عرصے تک......؟ کیا اب سچ میں اس کی حیثیت یہاں اس ٹوٹی ہوئی شاخ کی سی ہے جو درخت سے علیحدہ ہو چکی ہے؟'

'نہیں......نہیں، ہرگز نہیں......' بڑی بے چارگی سے اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔

بڑے سے آنگن میں آم اور شریفے کے پیڑ اسی طرح جھوم رہے ہیں، اس کی بوڑھی نحیف جاں بہ لب ماں سامنے کے پلنگ پر پڑی کھانس رہی ہے اور بڑی حسرت بھری نگاہوں سے اپنے اجنبی ہوتے ہوئے لختِ جگر کے ملول چہرے پر کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کے دیگر عزیز و اقارب بھی موجود ہیں...... سب کچھ تو ہے یہاں اس کا، اس کا منہدم ہوتا ہوا گھر، اس کی ماں...... اس کے عزیز و اقارب...... مگر...... مگر وہ خود یہاں کا نہیں رہا...... وقت کے ایک لمبے سفر نے اسے خود اس کے گھر میں ہی بیگانہ بنا دیا ہے۔ اس پر غیریت کی مہر اس طرح ثبت ہو چکی ہے کہ اسے اپنوں کے برتاؤ میں بھی تصنع کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ وہ اس مصنوعی زندگی سے اکتا رہا ہے۔ اسے تلاش ہے اپنے آپ کی...... اس اپنے پن کی جسے برسوں پہلے وہ خود اسی دہلیز پر چھوڑ گیا تھا۔

اپنا پن زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے کس قدر ضروری ہے، اس بات کو اس نے پہلے تو کبھی محسوس نہیں کیا

تھا۔لیکن ایک لمبے عرصے تک مشینی زندگی گزارنے کے بعد کسی چیز کی کمی کا احساس اس طرح سوہان روح بنا کہ وہ ہر آسائش کو لمحوں میں بھول گیا۔

اسے وہ دن بھی یاد تھا جب وہ اپنی جانی پہچانی دنیا کو خیر باد کہہ کر ایک ان دیکھی دنیا کی طرف پرواز کر رہا تھا۔اس وقت اس کے کانوں میں صرف ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔

'یار،اب تک تم تالاب کے مینڈک بنے رہے،باہر نکل کر دیکھو،دنیا کتنی حسین ہے۔کیا تم نے اعلیٰ تعلیم اور اونچی ڈگریاں اسی لئے حاصل کی ہیں کہ صبح سے شام تک چپل توڑتے رہو......؟' اس نے بدیشی دوست کے اس مشورے کا پر جوش استقبال کیا اور اس دن وہ بے حد خوش تھا جب اس کا ویزا باہر جانے کے لئے آ گیا تھا۔

وہ اس منظر کو بھی نہیں بھولا ہے جب وہ ایر پورٹ پر اپنے جہاز کا انتظار کر رہا تھا...... اس وقت اس کے سامنے ایک حسین دنیا آباد تھی اور وہ نرم ہواؤں کے دوش پر جھولا جھول رہا تھا۔اچانک زندگی کتنی سبک رفتار،کومل اور پرکشش بن گئی تھی۔زندگی کا سارا بوجھل پن نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔— جہاز کے اڑان بھرتے ہی وہ ساتوں آسمانوں کی سیر کرنے لگا تھا۔کیسے کیسے رنگین خیالات اس کے ذہن میں فلم اسکرین کی طرح منٹوں میں سین بدل رہے تھے۔— اپنی نحیف و ناتواں ماں،بیمار والد کو بھی چھوڑنے کا اسے ذرا غم نہیں تھا۔بچپن کے دوست،سب شناسا چہرے اچانک اجنبی بن گئے۔اسے محسوس ہوا جیسے وہ قید خانے سے نکل کر کھلی فضا میں کلیلیں بھرنے لگا ہے۔

خوبصورت اور اسمارٹ ایر ہوسٹس جب اس کے سامنے کھانے کی پلیٹ سجائے آئیں تو اسے لگا جیسے وہ جنت کی حوریں ہیں جو من وسلویٰ کے ساتھ اس کی میزبانی کر رہی ہیں۔اس نے ان کے دست نازنین سے پلیٹ لیتے ہوئے کنکھیوں سے انہیں دیکھا۔ایر ہوسٹس نے دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ دریافت کیا۔'کیا اور بھی چاہئے کچھ آپ کو......؟'

اس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔'نہیں...... ہاں......' اور پھر خود ہی اپنی اس بوکھلاہٹ پر بری طرح جھینپ گیا۔اس کے دل میں لمحہ بھر اس دلنواز مسکراہٹ پر گدگدی ہوتی رہی،لیکن پھر اس مسکراہٹ کی اصلیت اس پر واضح ہو گئی تھی،جب وہی ایر ہوسٹس اس کے پہلو میں بیٹھے ہوئے بوڑھے پنجر سے بھی اسی دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ مخاطب تھی۔

'اوہ! تو یہ ادائیں جلوۂ عام ہیں جن کو میں نے اپنے لئے مخصوص سمجھ لیا تھا۔' اپنی شخصیت کا سحر اسے ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ عمر کا یہ حصہ بھی کیسا پر فریب ہوتا ہے۔ منٹوں میں آسمان پر اور منٹوں میں زمین پر..... جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا، اس بات کی تمیز اس عمر میں ذرا مشکل سے ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں پر بھی ایک رنگین عینک چڑھی ہوئی تھی اور وہ ہر شئے کو بس اسی عینک سے دیکھ رہا تھا۔

بدیس پہنچ کر کچھ دنوں تک وہ ایک جادوئی دنیا میں کھویا رہا۔۔۔ گرد وپیش کو رنگین عینک سے دیکھنے کی تقریباً اسے عادت سی ہو گئی تھی لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد اس کی عینک کا شیشہ میلا ہونے لگا۔۔۔ اس کا معمول بن گیا تھا کہ گھر سے باہر قدم نکالتے وقت پہلے وہ اپنی عینک کے شیشے کو خوب صاف کرتا تاکہ وہ پہلی سی چمک واپس آجائے، مگر یہ دیکھ کر اسے بڑا دکھ ہوتا کہ شیشہ صاف ہونے کی بجائے میلا ہی ہوتا جا رہا تھا۔ انہی لمحوں میں اسے ایسا لگتا جیسے کوئی چیز چھناکے کے ساتھ اس کے اندر ٹوٹ گئی ہو اور اس کی ساری کرچیاں اندر ہی اندر چبھتی چلی جا رہی ہیں۔ ایک عجیب سی بے چینی کا مسکن بن گیا تھا اس کا دل و دماغ.....

کبھی کبھی وہ اپنے وجود کو پنڈولم کی طرح جھولتا محسوس کرتا، لامحدود فضاؤں میں معلق زمین سے منقطع اور آسمان سے دور۔

'یاالٰہی یہ کیسا جہاں ہے؟ باہر کی دنیا کیسی خوبصورت ہے لیکن اندر کی آتما کو چین نہیں۔۔۔ یہاں تو ہر شخص بس اپنے 'آج' میں جی رہا ہے۔۔۔' وہ اکثر غور وفکر میں ڈوبا رہتا۔

'کیا کل کے اعتبار کے بغیر آج کا حسن برقرار رکھا جا سکتا ہے۔۔۔؟'

'نہیں، ہرگز نہیں' اس کے اندر سے کوئی چیخ ابھرتی.....

'وقت، ماضی، حال اور مستقبل سے عبارت ہے۔ تم اسے صرف حال سے تعبیر نہیں کر سکتے۔'

اسے حیرت ہوتی ان ہم وطنوں پر جو صرف حال کے سہارے زندہ تھے۔۔۔ وہ اکثر ان کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کرتا۔

ایک دن اس نے اپنے قریبی دوست اسد سے دریافت کیا جو خود ان کی کمپنی میں ملازم تھا۔ 'یار اسد! یہاں کے لوگ کیا اپنی زندگی سے مطمئن ہیں.....؟ ان کا حال تو یقیناً خوبصورت ہے مگر مستقبل کا کوئی بھروسہ نہیں۔۔۔ کیا

اس بے اعتباری کے ساتھ کوئی حساس شخص خوش رہ سکتا ہے؟'

اسد نے غور کرتے ہوئے کہا، 'یار! تم ضرورت سے زیادہ حساس ہو۔ یہاں کے لوگ شاید اتنے حساس نہیں ہوتے۔'

'کیا مشینی عہد میں رہتے ہیں یہ بھی، روبوٹ (ROBOT) ہوگئے ہیں......؟' اس نے مسکراتے ہوئے طنز کیا۔

'ممکن ہے۔' اسد نے مختصر سا جواب دیا۔

'نہیں یار اسد! مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے آج کے عہد کا انسان کچھ زیادہ ہی حساس ہوگیا ہے۔ ماحول کی سردمہری نے اس کے اندر کی آگ کو کچھ زیادہ ہی بھڑکا دیا ہے۔'

'یہ سب تمہارا واہمہ ہے۔ اپنا مسئلہ تو صرف پیٹ کی آگ ہے۔' اسد کی مسکراہٹ میں درد بھی تھا اور طنز بھی، جسے بڑے سلیقے سے وہ چھپا رہا تھا۔

اسے اکثر اپنے جیسے دوسرے ساتھیوں کی زندگی پر ملال ہوتا، وہ جو سارا دن کڑی محنت کرتے اور جب گئی رات بستر پر لوٹتے تو بیوی بچے سب کو سویا ہوا پاتے...... پھر علی الصبح ساری کائنات کو سویا ہوا ہی چھوڑ کر اپنے اپنے کاموں میں چلے جاتے...... ان میں اکثر تو ہفتوں اپنے بچوں سے جی بھر بات بھی نہ کر پاتے...... بیوی کی مسکان کیا معنویت رکھتی ہے...؟ اس بات کا احساس بھی کھوتے جا رہے تھے۔ گویا ان کی زندگی کوئی سیال مادّہ ہو جو مشین میں ڈھل گئی ہو اور تیز چلتی ہوئی مشین کی گھر گھر کے ساتھ اندر کا ہر لطیف احساس بھی زائل ہو چکا ہو... وہ زیرِ لب کراہتا۔

'کیا زندگی صرف پیسے سے مطمئن ہو جاتی ہے...؟' باہر آکر وہ بھی یقیناً اچھی غذا کھا رہا تھا، اچھی خاصی رقم جمع کر رہا تھا۔ فریج، ٹی وی، اے سی، بہترین ایرکنڈیشنڈ کار، ویل فرنیشڈ مکان، سب کچھ کم ہی مدت میں اس نے حاصل کر لیا تھا۔ لیکن اکثر راتیں اس کی فوم کی آرام دہ مسہری پر کروٹیں بدلتے ہی گزر جاتیں... جب بھی گھر سے اس کی ماں یا کسی اپنے پرائے کا خط آتا تو وہ ہفتوں تک مضمحل مضمحل سا رہتا... بوڑھے باپ کے انتقال کی خبر ملی تو وہ جی بھر کے رو بھی نہ سکا۔ ماں کی علالت کی اطلاع ملی مگر وہ صرف تڑپ کر رہ گیا تھا۔

لیکن یہ کیسا وقت آگیا ہے کہ ایک طویل عرصہ گزار چکنے کے بعد اچانک وہاں کی سنہری سرزمین پر بھی وحشت کے بادل منڈلانے لگے ہیں۔۔۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ سہم رہا ہے۔ ان میں سے بیشتر بغیر کچھ سوچے سمجھے بنا زادِ راہ کے ہی رختِ سفر باندھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

وہ بھی اپنی چھوٹی سی فیملی کے ساتھ واپس آچکا ہے اور اپنے گھر کی دہلیز پر دیر سے کھڑا بیتے لمحوں کو واپس بلانے کی کوشش کر رہا ہے مگر اسے لگ رہا ہے جیسے یہ گھر اب اس کا اپنا گھر نہیں رہا...... در و دیوار کی ساخت تو وہی ہے، آم کے پیڑ اور شریفے کے پیڑ بھی وہی ہیں مگر اس کے قدموں کے نیچے کی زمین بہتا پانی بن گئی ہے۔ سخت دھوپ سے گھبرا کر اس نے نگاہیں اوپر کیں تو چھت کا سایہ بھی سر سے غائب تھا۔

لفظ و معنی

قدرے ۔ تھوڑا

باعث ۔ وجہ

اجنبی ۔ بیگانہ

پنہاں ۔ چھپا ہوا

بے بس ۔ مجبور

سبک رفتار ۔ سست رفتار

نحیف ۔ کمزور

جاں بہ لب ۔ مرنے کے قریب

شناسا ۔ جان پہچان

تصنع ۔ بناوٹ، ریاکاری

باطن ۔ اندرونی

سیال مادہ ۔ بہتی ہوئی چیز

سرد مہری ۔ غفلت، نظرانداز کرنا

دلدار ۔ دل رکھنے والا، محبوب

منہدم - ڈھادینا

پرواز - اڑان

آپ نے پڑھا

- آج کے جدید سائنسی اور مادی ماحول میں معاشرے میں جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ان مسائل کو ہی قمر جہاں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ چنانچہ زیر نصاب افسانہ 'کٹی ہوئی شاخ' اسی پس منظر سے متعلق ہے جس میں ایک شخص روپیہ کمانے کے لئے خلیجی ممالک جاتا ہے۔ روپیہ تو خوب کمالیتا ہے لیکن اپنے معاشرے اور تہذیب سے کٹ کر جس ذہنی کرب واذیت کا شکار ہوتا ہے، اس کیفیت کی ترجمانی اس افسانے میں بدرجہ اتم موجود ہے۔
- موجودہ عہد کی سائنسی ترقیوں اور ان کی ایجادات نے انسانی تہذیب کو تو متاثر کیا ہی ہے ساتھ ہی اخلاقی پہلو کو مجروح بھی کیا ہے۔ اسی موضوع پر ارتکاز کر کے افسانے کا مرکزی خیال پیش کیا گیا ہے جس میں مادیت کا غلبہ ہو گیا ہے۔ اسی پس منظر میں زیر نصاب افسانہ میں افسانہ نگار قمر جہاں نے ایک ایسے کردار کو پیش کیا ہے جو روپیہ کمانے کے لئے خلیجی ممالک جاتا ہے، روپیہ بھی خوب کماتا ہے، لیکن وہ معاشرے اور تہذیب سے کٹ کر جس ذہنی کرب واذیت کا شکار ہوتا ہے، اس کیفیت کی ترجمانی اس افسانے میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. قمر جہاں کی پیدائش کب ہوئی؟
2. قمر جہاں کے والد کا نام کیا ہے؟
3. قمر جہاں کا پیدائشی تعلق صوبہ بہار کے کس ضلع سے ہے؟
4. قمر جہاں کا کون سا افسانہ آپ کے نصاب میں شامل ہے؟
5. قمر جہاں کس یونی ورسٹی میں استاد ہیں؟

مختصر سوالات

1. قمر جہاں کے حالات زندگی پر پانچ جملے لکھئے۔
2. قمر جہاں کی تصانیف کی فہرست موضوع کے اعتبار سے لکھئے۔
3. قمر جہاں کی تعلیم وتدریس کے بارے میں مختصراً بیان کیجئے۔

4. اردو کے کسی پانچ افسانہ نگاروں کے نام لکھیے۔

طویل سوالات

1. قمر جہاں کے افسانوں کے موضوعات پر روشنی ڈالیے۔
2. کہانی کا عنوان 'کٹی ہوئی شاخ' کیوں ہے؟ واضح کیجیے۔
3. 'مہاجر ادب' کی اصطلاح سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ کیا یہ افسانہ اس زمرے میں ہے؟ مدلل جواب دیجیے۔
4. کہانی کے مرکزی کردار کی ذہنی وجذباتی کیفیت کو اختصار میں لکھیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے بہار کی خواتین افسانہ نگاروں کی ایک فہرست بنائیے۔
2. موجودہ سائنسی دور میں افسانہ نگاری کی افادیت پر ایک مذاکرہ کا اہتمام کیجیے۔

نگار عظیم

نگار عظیم عہد حاضر کی ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کا اصل نام ملکہ مہر نگار ہے۔ قلمی نام نگار عظیم ہے۔ وہ اردو دنیا میں مشہور و مقبول ہیں۔ اردو کے علاوہ انہوں نے ڈرائنگ اور پینٹنگ میں بھی ایم اے کیا۔ انہوں نے سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ پیش کر کے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی ہے۔ اس وقت خواتین افسانہ نگاروں میں ان کی خاص پہچان یوں بھی بنتی ہے کہ انہوں نے خواتین کے جذبات و محسوسات اور ان کے مسائل پر متعدد افسانے لکھے ہیں۔ جبر و استحصال اور موجودہ معاشرے کی انسانیت سوز صورت حال پر انہوں نے نہایت اثر انگیز افسانے لکھے ہیں۔

نگار عظیم کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'عکس' کے نام سے 1990ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد 1999ء میں مجموعہ 'گہن' شائع ہوا۔ افسانوں کے علاوہ انہوں نے سفرنامے اور تنقید کے میدان میں بھی نمایاں کام کئے ہیں۔ انہوں نے ہرچرن سنگھ چاؤلہ کی شخصیت اور فن کا جائزہ پیش کیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی شخصیت اور ان کی شاعری پر بھی ان کی اہم تنقیدی کتاب شائع ہو چکی ہے۔ نگار عظیم نے 'گرد آوارگی' کے نام سے ایک سفرنامہ بھی لکھا ہے جو خاصا مقبول ہوا۔

ABDIEL SOLUTIONS ABSOL PATNA

آشیانہ

اپنے بڑے بیٹے سراج اور بہو عرفانہ کے ساتھ رہتے ہوئے کئی برس بیت گئے تھے۔ ہر طرح کا سکھ چین تھا۔ یہاں دونوں ہر وقت ہر بات کا خیال رکھتے۔ ہر طرح کے عیش و آرام اور محبتوں سے نوازتے۔ دو پیارے پیارے پوتے بھی اللہ نے عطا کیے۔ عدنان تقریباً نو برس کا ہوگیا تھا اور فرحان ابھی پانچ برس کا۔ دونوں اسکول جاتے۔ دادا دادی سے محبت کرتے۔ پوکے مان، ہی مین اور بیسلیٹ کے قصے سناتے۔

لیکن ان سب کے باوجود اندر ہی اندر ایک طرح کا خالی پن، اداسی اور اکتاہٹ سی بھری رہتی۔ کبھی کبھی یہ اداسی گھٹن بن جاتی اور یہ سوچنے پر مجبور کردیتی کہ آخر ایسا کیوں؟ میرے شوہر برکت علی صدیقی ایک اچھے عہدے پر فائز تھے۔ اپنا چھوٹا سا مکان تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ ہمارے دو بچے تھے۔ دونوں کی پرورش اور اعلیٰ تعلیم میں عمر کا پہیہ اتنا تیز چلا کہ احساس ہی نہیں ہوا کب بوڑھے ہوگئے۔ بیٹی رقیہ کی ذمہ داری سے سبک دوش ہوئے اور سراج کی بنگلور ملازمت لگی تو اکیلے پن نے گھیر لیا۔ رقیہ اپنے خاندان کے ساتھ خوش و خرم اور آباد تھی۔ شروع شروع میں تو جلدی جلدی بیٹی داماد آتے لیکن جیسے جیسے دن گزرے ان کی مصروفیتیں بڑھیں تو بس بطور مہمان آتے۔ اور پھر سراج کی شادی ہوئی اور وہ بھی اپنی بیوی کے ساتھ بنگلور آباد ہوگیا۔ لیکن برکت جیسے ہی ریٹائر ہوئے، سراج اور عرفانہ ضد پکڑ کر اپنے ساتھ بنگلور لے گئے۔ اور وہ آشیانہ جو ہم نے تنکا تنکا کر کے بنایا تھا بیٹے بہو کی محبت میں بہت دور چھوٹ گیا۔ بیٹے بہو نے خدمت گزاری اور دلجوئی میں دن رات ایک کردیئے۔ کبھی کبھی ہم دونوں میاں بیوی اس خدمت سے شرمسار بھی ہوئے۔ جب ناشتے کی میز پر بہو سلائس پر مکھن کی موٹی تہہ لگا کر پیش کرتی تو یہ بھی مسکراتے اور میں بھی ہنس پڑتی اور کہتی پیاری بہو رانی اس عمر میں اتنا مکھن کھلاؤ گی تو دس بیماریاں اور پل جائیں گی اور تمہارا کام اور بڑھ جائے گا۔

اللہ نہ کرے امی جان۔ بیمار ہوں آپ کے دشمن۔ ایسا نہ کہیے۔ اس عمر میں کھائیں گی نہیں تو طاقت کہاں

سے آئے گی۔ کیوں ابو جان؟ اور ابو جان مسکرا پڑتے۔

کھانے پینے اور پھل فروٹ سے لے کر روز مرہ کی تمام ذمہ داریوں اور ضرورتوں کا وہ پورا خیال رکھتے۔ کچھ وقت پوتوں کے ساتھ باتیں کرنے، ان کے کھیل سیکھنے میں گزر جاتا۔ سراج آفس چلا جاتا۔ بہو گھر کے اور باہر کے کاموں میں مصروف رہتی۔ نئے زمانے کی ہوتے ہوئے بھی وہ پرانی قدروں سے جڑی ہوئی تھی۔ واقعی سراج کی پسند لاجواب تھی۔ دونوں میں کبھی کبھی تکرار بھی ہوتی۔ کیونکہ عرفانہ گھر کی نہ ہوکر ملازمت بھی کرنا چاہتی تھی۔ جبکہ سراج اسے غیر ضروری سمجھتا تھا۔ اسے اللہ نے اچھی ملازمت اور ہر آرام مہیا کیا تھا اور وہ عرفانہ کو خواہ مخواہ نوکری کے جوکھم میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

ابتدا میں بنگلور آکر ان کے ساتھ رہنا بہت اچھا اور خوشگوار لگا۔ نہ کھانے پکانے کی فکر نہ دال دلیے کا حساب، نہ پاس پڑوس اور آنے جانے والوں کا جھنجھٹ۔ لفٹ سے ساتویں منزل پر چڑھتے اور اترتے۔ کس فلیٹ میں کون رہتا ہے کیا کرتا ہے، مردہ یا زندہ کون جانے؟ بہت کوشش کرتی بہو کوئی کام کرنے دے لیکن وہ ہاتھ ہی لگانے نہ دیتی۔ دل چاہتا کہ برکت اور سراج کی پسند کی ڈش میں بھی بناؤں لیکن عرفانہ اتنے پیار سے منع کرتی کہ میں خاموش ہوجاتی۔

'کیا امی جان؟ ساری عمر تو ہوگئی آپ کو کام کرتے، پکاتے کھاتے، بس اب آپ کے آرام کے دن ہیں۔ سراج بتاتے ہیں آپ بہت کام کرتی تھیں۔ بہت اچھے کھانے پکاتی تھیں۔ لیکن اب نہیں اب میں ہوں نا!'

اور میں کچن سے باہر نکل آتی۔

سراج بھی عرفانہ کی زبان بولنے لگتا۔۔۔ امی آپ آرام کیجیے۔ آپ کام کیوں کرتی ہیں۔ عرفانہ کو پریشانی ہوگی تو نوکر رکھ لے گی۔'

حالانکہ صفائی ستھرائی برتن جھاڑو اور کپڑے دھونے کے لیے دو دو آیا لگی ہوئی تھیں۔ لیکن عرفانہ کھانا ہمیشہ خود ہی پکاتی۔ اچھا اور ذائقہ دار پکاتی۔ مجھے کئی مرتبہ احساس ہوا کہ دو دو ملازماؤں کو پیسہ جاتا ہے۔ یہ چھوٹے موٹے گھر کے کام تو میں بھی کرسکتی ہوں لیکن سراج اور عرفانہ نے اس طرح کبھی نہیں سوچا کہ میں کام کروں۔ انہیں تو میرا آرام بے حد پسند تھا۔ کبھی کسی کام کے لئے ملازمہ کو ٹوکتی کہ سبزی ایسے دھوؤ، فریج میں ایسے رکھو۔ کپڑے

ایسے پھیلاؤ، سفید کپڑوں کے ساتھ رنگین کپڑے نہ دھوؤ تو سراج فوراً بول پڑتا۔ ارے امی یہ دردِ سر آپ کیوں مول لیتی ہیں۔ اس کے لئے تو آپ کی بہو ہی کافی ہے۔ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟ اب میں کیا سمجھاؤں کہ میں پریشان نہیں ہوں۔ اس گھر پر اپنا حق سمجھتی ہوں۔ یہ میرے بیٹے اور بہو کا گھر ہے۔ یہ گھر پرایا نہیں ہے۔ صفائی ستھرائی یا گھر کے کام کاج پر میں نظر نہیں رکھوں گی تو کون رکھے گا؟ آخر میں گھر کی بڑی ہوں۔ بہو پر ابھی سے اتنی ذمہ داریاں ٹھیک نہیں۔ لیکن میں ایسا کچھ بھی نہیں کہتی۔ بس خاموش ہوجاتی۔

دراصل عرفانہ نے اپنے گھر کے نظام اور حقوق میں کسی دخل اندازی کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ میں شکایت کرتی بھی تو کس بات کی۔ ان دونوں نے بڑی عزت، محبت اور احترام کے ساتھ مہمانوں کی طرح اپنے گھر میں اور دل میں جگہ دی تھی۔ جب بھی دونوں میں ناراضگی یا کھٹ پٹ ہوتی تو موقع دیکھ کر سراج سے کہتی۔

'بہو اگر ملازمت کرنا چاہتی ہے تو کرنے دو پڑھی لکھی ہے۔ آج کل سب لڑکیاں کرتی ہیں اور پھر میں ہوں نا...... گھر کی تمام ذمہ داری میں سنبھال لوں گی۔ خالی ہی تو بیٹھی رہتی ہوں۔ یہاں مجھے کوئی کام ہی نہیں۔ پھر دو دو آیا لگی ہوئی ہیں۔'

'نہیں امی یہ مسئلہ نہیں۔ ان بڑے شہروں کے مسائل ہی دوسرے ہیں۔ دن بھر بسوں اور ٹرینوں میں دھکے کھانے پڑتے ہیں اور بھی کئی باتیں ہیں اور پھر خدانخواستہ کوئی پریشانی ہو تو چلو ٹھیک ہے۔ میرا اب پروموشن ہونے والا ہے۔ میری سیلری اور بڑھ جائے گی اور پھر کون سا بہت بڑا کنبہ ہے ہمارا......'

سراج کے دلائل سن کر میں خاموش ہوجاتی اور بہو بھی بول پڑتی۔

'امی آپ فکر نہ کیجیے۔ ان کی عقل میں میری بات آئے گی ہی نہیں۔'

دن یوں تو بہت آرام سے گزر رہے تھے۔ لیکن دل کی نیا ڈولتی رہتی۔ برکت بھی بیٹے کے یہاں بظاہر خوش اور مطمئن نظر آتے لیکن ان کی بے چینی میری نظروں سے پوشیدہ نہ تھی۔ میں برکت کے مزاج کو بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ لیکن ایک انجانا سا خوف مجھے ان کے دل کے تاروں کو چھیڑنے سے روکے رہتا۔ اس میں رتی برابر بھی شک نہیں کہ ہمارا بیٹا اور بہو بہت لائق باادب اور ہزاروں میں ایک تھے۔ ہمیں تو ان پر فخر ہونا چاہیے تھا۔ ان کے گن بیان کرنے چاہئے تھے۔ جیسے عرفانہ اپنی سہیلیوں سے ہمارے گن گاتی تھی۔ لیکن ہمیں اتنا موقع بھی کہاں ملتا

تھا۔ یا پھر شاید ہم خود کو ہی نہیں سمجھ سکے کہ ہم چاہتے کیا ہیں؟ اپنا ہاتھ اختیار؟ اپنی بادشاہت؟ ہم عمر ساتھی؟ عیش و آرام؟ یا پھر اپنا پن؟

ہم سب جب کبھی ایک ساتھ بیٹھتے اور پرانی باتیں چھڑتیں تو مجھے احساس ہوتا برکت کے اندر بھی کہیں نہ کہیں مایوسی پنپ رہی ہے۔ نہ جانے وہ کیا سوچتے رہتے تھے۔ اور پھر ایک روز وہ خود ہی بول پڑے۔

' تھک گیا ہوں میں آرام کرتے کرتے اور کتابیں پڑھتے پڑھتے۔ مجھے یہاں آنے کے بجائے کہیں کوئی کام یا نوکری کرنا چاہیے تھی۔ شاید ہم نے یہاں آکر غلطی کی زرینہ۔ یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔ یہ تو بیٹے اور بہو کا گھر ہے۔ ہم تو اس گھر کے مہمان ہیں۔ اور مہمان تو دن دو دن کا ہوتا ہے برسوں کا نہیں۔ اسی مہمانی میں دو برس گزار دیئے ہم نے۔ بہت ہوئے ہیں دو برس۔ اب میں بیمار سا ہو گیا ہوں۔ کیا تم اپنے بیٹے بہو کو چھوڑ کر میرے ساتھ اپنے چھوٹے سے گھر میں واپس چلوگی۔ جہاں تم پکاؤ گی اور میں کھاؤں گا۔ چٹنی روٹی ہی سہی۔ اپنا پڑوس ہوگا، شام کی محفلیں ہوں گی اور پھر بیٹا بہو چھوٹ تھوڑے ہی جائیں گے۔ ہم سب آتے جاتے رہیں گے۔'

برکت کی محبت اپنائیت اور خود اعتمادی نے میرے اندر سیکڑوں چراغ روشن کر دیئے اور ہم نے پھر اپنا آشیانہ آباد کرنے کا فیصلہ لے لیا۔

لفظ و معنی

عطا کرنا ۔ دینا

فائز ہونا ۔ مقرر ہونا، عہدے پر رہنا

سبک دوش ۔ ملازمت کی مدت پوری کر لینا، فارغ ہو جانا

دل جوئی ۔ خوش کرنا، خیال رکھنا

شرمسار ۔ شرمندہ

نظام ۔ انتظام، قرینہ

خود اعتمادی ۔ اپنے آپ پر بھروسہ

جوکھم ۔ دشواری، پریشانی

آپ نے پڑھا

- اس کہانی میں افسانہ نگار نے خوش حال اور فارغ البال مرد اور عورت کی نفسیات کو پیش کیا ہے جنھیں ضعیفی میں اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ مشترکہ خاندان میں نہ صرف کمزور معاشی طبقے کے افراد کے لئے مسائل کھڑے ہوتے ہیں بلکہ اکثر صورتوں میں خوش حال افراد بھی اول اول اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں اور پھر آپس میں ناچاقی بڑھتی جاتی ہے۔ برکت علی صدیقی اور ان کی بیگم کو جب اپنے بیٹے سراج اور بہو عرفانہ کے ساتھ رہنا پڑا تو رفتہ رفتہ اچھے تعلقات میں دراڑ پیدا ہونے لگی۔ افسانہ نگار نے اکتاہٹ اور یکسانیت سے پیدا ہونے والے خانگی انتشار کو کرداروں کی نفسیات کی روشنی میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. نگار عظیم کا اصل نام کیا ہے؟
2. نگار عظیم نے کس کس موضوع میں ایم اے کیا؟
3. نگار عظیم کے اولین افسانوی مجموعے کا نام کیا ہے؟
4. نگار عظیم کا مجموعہ 'گہن' کب شائع ہوا؟
5. نگار عظیم کے سفرنامہ کا نام کیا ہے؟

مختصر سوالات

1. 'سہی' اور 'صحیح' کے فرق کو جملے میں استعمال کر کے واضح کریں۔
2. نگار عظیم کی شخصیت پر پانچ جملے لکھیے۔
3. صنف افسانہ پر پانچ جملے لکھیے۔

طویل سوالات

1. سراج کی والدہ اپنے بیٹے کے گھر پر اکتاہٹ کیوں محسوس کرنے لگی؟
2. زیر نصاب افسانہ 'آشیانہ' کے مرکزی کردار پر روشنی ڈالیے۔
3. افسانے کے ارتقاء کا جائزہ لیجیے۔

4. نگار عظیم کی افسانوی خصوصیات بیان کیجیے۔

- مندرجہ ذیل الفاظ کی جمع بنائیے۔

ضد، خدمت، موقع، مسئلہ، منزل

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے بہار کے مختصر افسانہ نگاروں کی ایک فہرست بنائیے۔
2. بہار میں کن کن موضوعات پر مختصر افسانے لکھے جا رہے ہیں، اس پر ایک مذاکرہ کا اہتمام کیجیے۔

مضمون

یہ ایک قدیم نثری صنف ہے جس میں کسی ایک مخصوص عنوان پر سیر حاصل بحث ہوتی ہے۔ مضمون مختصر بھی ہوتا ہے اور طویل بھی۔ ضرورت اور معیار کے مطابق مضمون لکھا جاتا ہے۔ آج کل تو پرائمری اسکولوں کے بچوں کو بھی مضمون نویسی کی تدریس دی جاتی ہے۔ مضمون نگاری میں کافی وسعت اور تنوع ہے۔ مضامین مختلف نوعیت کے ہو سکتے ہیں جیسے علمی مضامین، سائنسی مضامین، مذہبی، اخلاقی، اصلاحی اور سیاسی مضامین وغیرہ۔ مضمون نگاری میں کافی آزادی اور کشادگی ہے۔ ہم ایک جاندار اور معمولی چیزوں پر بھی مضمون لکھ سکتے ہیں۔ اسکول کے مضامین میں عنوان کی تشریح، اس کی صفات اور عیوب پیش کیے جاتے ہیں۔ معیاری مضامین میں علمیت اور جامعیت بھی ہوتی ہے اور قلم کار کے قلم و ذہن کی جولانیت بھی۔

ہر دور میں مضمون نویسی اردو کی نثری صنف کی ایک اہم صنف بنی رہی اور ہنوز یہ مقام مضمون نویسی کو حاصل ہے۔ آج پرائمری درجات اور ملک کے مقابلہ جاتی امتحانات کے نصابوں میں بھی یہ شامل ہے۔ فورٹ ولیم کالج سے اس کا آغاز ہوا اور سلسلہ ہنوز قائم ہے۔ ہمارے مشہور و معروف مضمون نگاروں میں سر سید احمد خاں، محسن الملک، محمد حسین آزاد، حالی، ذکاء اللہ، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی وغیرہ نے تو اس صنف کو کافی جلا بخشی ہے۔

عالمی حدت (GLOBAL WARMING)

ہم لوگ جس زمین پر رہتے ہیں، وہ ایک سیارہ ہے۔ یہ زمین بھی جانداروں کے لئے بہت مناسب ہے دوسرے سیاروں کا ماحول پودوں اور جانوروں کے لئے ٹھیک نہیں ہے یا تو یہ بہت ہی گرم ہے یا بہت ٹھنڈا۔ ہماری زمین کا درجۂ حرارت (Temperature) بہت موزوں ہے اور معتدل ہے اسی لئے یہاں طرح طرح کے پودے، جانور اور انسان پائے جاتے ہیں۔ لیکن پچھلے تیس چالیس برسوں سے ہماری زمین کا درجۂ حرارت رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔ زمین کے درجۂ حرارت میں جو اوسط اضافہ ہو رہا ہے اسے ماہرین ماحولیات نے 'تمازتِ ارضی میں تدریجی اضافہ (Global Warming) کا نام دیا ہے۔

پوری دنیا میں پچھلے دس برسوں سے اس کا بہت ذکر اور چرچا ہو رہا ہے۔ آج گلوبل وارمنگ ایک سنگین عالمی مسئلہ اور چیلنج بن گیا ہے۔ دنیا کے سارے سائنس داں اس مسئلہ پر بہت فکرمند ہیں۔ امریکہ، جرمنی اور اقوام متحدہ (UNO) میں اس مسئلہ پر سائنس دانوں کے درمیان کافی تبادلۂ خیالات ہوئے اور اس سے مدافعت کے لئے کئی اہم اقدام ان ممالک میں لئے جا رہے ہیں۔

تم سوچ رہے ہوگے کہ آخر ہماری دنیا کا درجۂ حرارت کیوں بڑھ رہا ہے یعنی گلوبل وارمنگ کی وجہ کیا ہے؟ اس کی سب سے اہم وجہ خود ہم انسانوں کی کچھ سرگرمیاں ہیں جن کو سائنس کی زبان میں 'گرین ہاؤس گیسوں کے اثرات' (Effects of Green House Gases) کہتے ہیں۔ کل کارخانوں، موٹر گاڑیوں کے اضافے اور جنگلوں کے بے تحاشہ کٹنے سے گیسیں زیادہ پیدا ہو رہی ہیں۔ مثال کے طور پر آبخرہ، کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2)، میتھن (CH_4)، نائٹرس آکسائیڈ (NO_2)، اوزون (Ozone) وغیرہ۔ ان میں کاربن ڈائی آکسائیڈ پہلے کے مقابلہ میں 31% اور میتھن 149% زیادہ پیدا ہونے لگی ہیں۔ میتھن گیس دھان کے کھیتوں اور گائے بھینس کے گوبر سے زیادہ نکلتی ہے۔ ہماری زمین پر آفتاب کی جو شعاعیں آتی ہیں، وہ انہیں زیادہ جذب کر لیتی ہیں اور اس کی وجہ سے زمین کا

ماحول گرم ہو جاتا ہے یا دوسرے لفظوں میں اس کا درجۂ حرارت بڑھ جاتا ہے۔

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ہماری زمین کا درجۂ حرارت پچھلے سو برسوں میں تقریباً 0.75^{0}c بڑھ گیا ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو اس بات کا امکان ہے کہ اکیسویں صدی میں 1^{0}c سے 6^{0}c تک کا اضافہ ہو جائے۔ یہ بہت تشویش ناک بات ہے۔

زمین کے درجۂ حرارت بڑھنے کی وجہ سے سمندری برف کے بڑے بڑے تودے تیزی سے پگھلتے ہیں۔ اس کی وجہ سے سمندر میں پانی کی سطح تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ماہرین ماحولیات کا خیال ہے کہ اس کی وجہ سے کئی جزیروں کے ہمیشہ کے لئے سمندر میں ڈوب جانے کا اندیشہ ہے۔ پڑوسی ملک بنگلہ دیش کا کچھ حصہ، ہمارے دیش بھارت کے کچھ دکنی ساحلی علاقے، مالدیپ وغیرہ بھی ڈوب سکتے ہیں۔

تمازت ارضی میں تدریجی اضافہ (Global Warming) کی وجہ سے آب و ہوا میں بڑی تبدیلی آتی جارہی ہے۔ موسموں کی معینہ مدت میں بھی بدلاؤ آ گیا ہے۔ کئی ٹھنڈے ملکوں میں اب کافی گرمی پڑنے لگی ہے۔ بہت سے جانور اور پودے دنیا سے ختم ہوتے جارہے ہیں۔ اس کے برعکس بیکٹریا جراثیم اور وائرس زیادہ پنپنے لگے ہیں۔ جن سے کئی خطرناک قسم کی بیماریاں ہورہی ہیں۔ طوفان، سیلاب اور قحط کی کثرت ہے۔ گلوبل وارمنگ ایک عالمی مسئلہ ہے لیکن ہر ملک کو اپنے اپنے طور پر اس مہلک وبا سے بچنے کی ترکیبیں اور اقدام کرنے ہوں گے۔

ہمیں اب اس خطرناک مسئلہ کا مقابلہ کے لئے غور وفکر کرنا ہوگا۔ یہ ہمارے ملک کے ہر شہری کا فرض ہے کہ جس قدر ممکن ہو اس سے بچنے کے لئے ترکیب کرے اور حکومت کے ذریعہ اس کے لئے جو ہدایات دیئے جائیں، ان پر عمل کیا جائے۔ حکومت کے منصوبوں میں بھرپور تعاون کیا جائے۔

ان حالات میں ہم لوگ کیا کریں؟

ہم سبھی لوگوں کو اپنی زمین کو زیادہ گرم ہونے سے بچانے کی لگاتار کوشش کرنی ہوگی۔ دنیا کے بڑے اور ترقی یافتہ ممالک جیسے امریکہ، فرانس، جرمنی، چین، جاپان، انگلینڈ، کوریا اور روس کو گرین ہاؤس گیسوں کی مقدار کم کرنی ہوگی۔ جنگلوں کو کٹنے سے روکنا ہوگا۔ پودوں اور درختوں کو زیادہ سے زیادہ پھلنے اور پھولنے دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ پیڑ پودوں کو لگانے کی تحریک چلائی جائے۔ گیس پھینکنے والی گاڑیوں کو سڑکوں پر چلانے پر پابندی لگائی جائے۔

لکڑیوں اور کوئلہ کو کم سے کم جلایا جائے۔ ہم لوگوں کو فطرت (Nature) کے ساتھ زندگی گزارنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ۲۰۰۷ء میں کیوٹو (Kyoto) میں اس کے لئے ایک اہم کانفرنس بھی ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں ایک مشترکہ دستاویز تیار کی گئی جس پر مختلف ملکوں کے نمائندوں نے دستخط کئے اور حلف لیا گیا کہ ہر ملک اس دستاویز کی ہدایات کے مطابق گلوبل وارمنگ سے بچنے کے لئے اپنے اپنے ملک میں عمل کرے گا۔ اس تمازت کو کم کرنے کے لئے بہت سارے ملکوں میں کوششیں جاری ہیں۔ امریکہ کے سابق نائب صدر الگورے (Al Gore) نے پورے ملک میں گھوم گھوم کر گلوبل وارمنگ سے بچنے کے لئے تقریریں کیں، اشتہارات تقسیم کرائے اور ایک کتاب بھی تصنیف کی جس میں لوگوں کو اس کے خطرات، اثرات اور دفاع کے تراکیب سے روشناس کیا۔

۲۷ ردسمبر سے ۳۱ ردسمبر ۲۰۰۸ء تک پانچ دنوں کا بال وگیان کانگریس (Child Science Congress) ناگالینڈ کے شہر دیماپور میں منعقد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر سابق صدر ہند اور عالم گیر شہرت یافتہ سائنس داں جناب اے پی جے عبدالکلام تھے۔ اس پانچ روزہ کانگریس کے دو ہی موضوعات تھے: 'پولوشن اور گلوبل وارمنگ'۔ اس کانگریس میں ملک کے ۳۲ صوبوں اور مرکزی حکومت کے مخصوص خطوں سے چن کر ۵۵۶ طلباء و طالبات کو شرکت کرنے کا موقع دیا گیا۔ پورے ملک سے ۱۶۵ اساتذہ نے بھی اس کانگریس میں حصہ لیا۔

بچو! دیکھو ہمارے ملک کی حکومت گلوبل وارمنگ سے بچنے اور نپٹنے کے لئے کتنے بڑے پیمانے پر کام کر رہی ہے۔ پورے ملک میں تحریک چلانے کی ضرورت ہے اور حکومت یہ کام آج کے طلبا و طالبات میں بیداری لاکر کرا رہی ہے۔ نئی نسل کے ابھرتے ہوئے بالغ طلبا اور طالبات پر ہی ملک کی ساری ذمہ داری آنے والی ہے۔ ان کے ذریعہ انقلابی صورت میں اس خطرہ سے بچنے کے تراکیب کرنے ہوں گے۔

مذکورہ بالا کانگریس میں مہمان خصوصی جناب اے پی جے عبدالکلام نے ان سنگین مسائل کو دور کرنے، حل کرنے اور بچنے کی ذمہ داری مکمل طور پر آج کے طلبا و طالبات پر دی۔ گلوبل وارمنگ کے سنگین مسائل پر بولتے ہوئے مہمان خصوصی نے کہا کہ اس سے نپٹنے کا اکسیر نسخہ یا جادوئی منتر یہ ہے کہ ۱۰ سے ۱۷ سال کی عمر والے بیس لاکھ بچے پانچ پانچ پیڑ لگادیں تو ہمارے زیادہ تر مسائل حل ہو جائیں گے۔

ماخوذ

لفظ و معنی

تمازت	۔	گرمی، حدت، تپش
ارضی	۔	زمینی
تدریجی	۔	رفتہ رفتہ، منزل بہ منزل
اضافہ	۔	زیادتی، بڑھنا
حرارت	۔	گرمی
موزوں	۔	مناسب
معتدل	۔	برابر، متوازن، ٹھیک
سنگین	۔	پیچیدہ، تشویش ناک
مدافعت	۔	بچاؤ، روکنا
سرگرمیاں	۔	حرکات، کام، عمل
بے تحاشہ	۔	لگاتار، بے شمار
آبخرہ	۔	گرم پانی کا بھاپ
شعاعیں	۔	کرنیں
امکان	۔	ممکن
ماہرین ماحولیات	۔	علم ماحولیات کے عالم حضرات
برعکس	۔	برخلاف، الٹا
قحط	۔	خشک سالی
مہلک	۔	ہلاک کرنے والا، خطرناک
تعاون	۔	مدد
مشترکہ	۔	آپسی میل جول، ملا جلا
دستاویز	۔	وثیقہ، عہد نامہ

دفاع	-	بچاؤ
عالمگیر	-	پوری دنیا میں
شہرت یافتہ	-	مشہور و معروف
عنوانات	-	موضوعات
بالغ	-	جوان
اکسیر	-	لاجواب، لاثانی، نہایت مفید

آپ نے پڑھا

- پچھلے تیس چالیس برسوں سے ہماری زمین کا درجۂ حرارت رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔ اس درجۂ حرارت میں جو اوسط اضافہ ہو رہا ہے، اس کو گلوبل وارمنگ کہتے ہیں۔
- گلوبل وارمنگ ایک سنگین عالمی مسئلہ ہے۔ دنیا کے سائنسداں اس کے لئے بہت فکرمند ہیں اور اس سے بچنے کے لئے غور وفکر کیا جا رہا ہے اور کچھ ملکوں میں اس کے لئے کئی اہم قدم اٹھائے گئے ہیں۔
- گلوبل وارمنگ کی وجہ گرین ہاؤس کی گیسوں کے اثرات، بے شمار کل کارخانوں کا کھلنا، تیزی کے ساتھ جنگلوں کا کٹنا اور موٹر گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ ہے۔
- میتھن گیس دھان کے کھیتوں اور جانوروں کے گوبر سے زیادہ نکلتی ہے۔
- زمین کے درجۂ حرارت بڑھنے سے پودوں کا ختم ہو جانا اور خطرناک بیماریوں میں اضافہ، طوفان، سیلاب اور قحط کا سامنا جیسے حالات و حادثات کے ہم شکار ہو رہے ہیں۔
- گلوبل وارمنگ کو کم کرنے اور اس سے بچنے کے لئے دنیا کے بڑے ملکوں کو گرین ہاؤس گیسوں کی مقدار کو کم کرنا ہوگا، جنگلوں کو کٹنے سے روکنا ہوگا، پودوں اور درختوں کو زیادہ سے زیادہ لگایا جائے۔ شجرکاری کی تحریک چلائی جائے۔

معروضی سوالات

1. گلوبل وارمنگ کیسا مسئلہ ہے؟

(الف) مناسب (ب) خوشگوار (ج) سنگین (د) معتدل

2. کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس میں کتنا اضافہ ہوا ہے؟

(الف) 21% (ب) 31% (ج) 14% (د) 11%

3. زمین کا درجۂ حرارت پچھلے سو برسوں میں کتنا بڑھ گیا ہے؟

(الف) 0.45^0c (ب) 0.55^0c (ج) 0.65^0c (د) 0.75^0c

4. بال وگیان کانگریس ۲۰۰۸ء بھارت کے کس شہر میں منعقد ہوا؟

(الف) پونا (ب) شملہ (ج) دیماپور (د) وشاکھاپٹنم

5. کیوٹو میں گلوبل وارمنگ پر کانفرنس کب ہوئی تھی؟

(الف) ۲۰۰۷ (ب) ۲۰۰۶ (ج) ۲۰۰۵ (د) ۲۰۰۴

مختصر سوالات

1. زمین ابھی جانداروں کے لئے مناسب ہے یا غیر مناسب ہے؟
2. گلوبل وارمنگ کیسا مسئلہ ہے؟
3. گلوبل وارمنگ کیا ہے؟
4. گرین ہاؤس گیسوں میں کون کون گیس ہے؟
5. زمین کے درجۂ حرارت میں کاربن ڈائی آکسائیڈ اور میتھین گیسوں کا کتنا اضافہ ہوا ہے؟
6. گلوبل وارمنگ سے بچنے کے لئے طلباء کو عبدالکلام صاحب نے کون سا جادوئی منتر بتایا؟

طویل سوالات

1. گلوبل وارمنگ سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
2. گلوبل وارمنگ کے کیا اسباب ہیں؟
3. گلوبل وارمنگ کے تشویش ناک اثرات کیا ہوں گے؟
4. گلوبل وارمنگ سے بچنے کے لئے کیا کیا اقدام اٹھائے جاسکتے ہیں؟
5. اس سبق میں جن الفاظ میں سابقے ہیں، انہیں چن کر جملے بنائیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. دو الگ الگ چارٹ پر گلوبل وارمنگ کے اسباب اور اثرات کو تصویر بنا کر اپنے درجہ میں آویزاں کریں۔
2. گلوبل وارمنگ سے بچنے کے پانچ اقدام جلی لفظوں میں لکھ کر اسکول کے نوٹس بورڈ، اسکول گیٹ اور اہم جگہوں پر آویزاں کریں اس کام میں اپنے سائنس ٹیچر کا تعاون لیں۔
3. سائنس ٹیچر کے تعاون سے آپ گلوبل وارمنگ کی تحریک اپنے علاقہ میں چلائیں۔ اس تحریک میں اپنے چند ساتھیوں کو بھی رکھئے۔ ہفتہ میں ایک روز ۲ گھنٹے کی یہ تحریک ہو اور اس کی رپورٹ اپنے سائنس ٹیچر کو لکھ کر دیں۔

ABDIEL SOLUTIONS ABSOL PATNA

سرسید احمد خاں

سرسید احمد خاں دلی کے ایک معزز گھرانے میں 1817ء میں پیدا ہوئے سرسید کی تربیت ان کی والدہ کے زیرسایہ ہوئی۔

تحصیل علم کے بعد 1862ء میں غازی پور میں انہوں نے ایک انجمن 'سائنٹفک سوسائٹی' کے نام سے بنائی۔

1869ء میں سرسید انگلستان گئے۔ واپس آکرانہوں نے 'تہذیب الاخلاق' نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس میں سماجی، تہذیبی اور ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔

سرسید احمد خاں نے علی گڑھ میں ایک اسکول کھولا جو 1878ء میں 'محمڈن اینگلو اورینٹل کالج' بنا اور پھر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا۔

1878ء میں سرسید احمد خاں کو 'سر' کا خطاب ملا جوان کے نام کا ایک حصہ بن گیا۔ سرسید احمد خاں کی تصانیف میں 'آثار الصنادید' اور 'اسباب بغاوت ہند' خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔

اردو کی نئی علمی نثر کی بنیاد ڈالنے کے ساتھ ساتھ سرسید نے اردو میں مختصر مضمون نگاری کو فروغ دیا۔ لمبی تحریروں کی بجائے چند صفحات میں کام کی باتیں کہنے کا فن سرسید نے عام کیا۔ سرسید کی نثر میں وہی وزن اور وقار ہے جو ان کی شخصیت میں تھا۔

سرسید احمد خاں کا انتقال 1898ء میں ہوا اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں دفن ہوئے۔

ریا

دنیا میں ایسے لوگ بھی بہت ہیں جن کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہوتا ہے۔ دنیادار اور رند مشرب آدمی جس قدر کہ دراصل وہ بد ہیں اس سے زیادہ اپنے تئیں وہ بد بناتے ہیں۔ دینداری کی بناوٹ کرنے والے جس قدر کہ ہوتے ہیں اس سے زیادہ نیک اپنے آپ کو جتلاتے ہیں وہ تو دیندار کی ذرا ذرا سی باتوں سے بھی بھاگتے ہیں اور دن رات عشق وتماش بینی اور رچ پنے کی باتوں کی جن کو دراصل انہوں نے کی بھی نہیں، گپیں اڑاتے ہیں۔ اور یہ حضرت بے شمار گناہوں اور بدیوں کو ایک ظاہری دینداری کے پردہ میں چھپاتے ہیں اور ٹٹی کی اوجھل میں شکار کھیلتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں قسم کے آدمی چنداں برے نہیں ہیں مگر ایک اور تیسری قسم کے لوگ ہیں جو ان دونوں قسموں سے علیحدہ ہیں اور انہیں کا کچھ ذکر میں اس تحریر میں کرنا چاہتا ہوں۔ ان کی بناوٹ ایک اور ہی عجیب قسم کی ہے۔ وہ اپنی بناوٹ سے دنیا کے لوگوں ہی کو فریب نہیں دیتے بلکہ اکثر خود آپ بھی دھوکہ میں پڑتے ہیں۔ وہ بناوٹ خود ان کے دل کے حال کو چھپاتی ہے۔ جس قدر کہ درحقیقت وہ نیک ہیں اس سے زیادہ ان کو نیک جتاتی ہے۔ پھر تو وہ لوگ یا اپنی بدیوں پر خیال ہی نہیں کرتے یا ان بدیوں کو نیکیاں سمجھتے ہیں۔ مقدس داؤد نے نہایت دلچسپ لفظوں میں اس برائی سے پناہ مانگی ہے اور اس طرح پر خدا کی مناجات کی ہے۔ 'کون اپنی غلطیوں کو سمجھ سکتا ہے تو ہی مجھ کو میرے پوشیدہ عیبوں سے پاک کر۔' جو لوگ علانیہ بدی کرتے ہیں اگر ان کو بدیوں اور گناہوں سے بچانے کے لئے نصیحت کی ضرورت ہے تو وہ لوگ جو درحقیقت موت کی راہ چلتے ہیں اور اپنے تئیں نیکی اور زندگی کے راستہ پر سمجھتے ہیں کس قدر رحم کے لائق ہیں اور کتنی نصیحت کے محتاج ہیں پس میں چند قاعدے بیان کرنا چاہتا ہوں جن سے وہ بدیاں جو دل کے کونوں میں چھپی ہوتی ہیں اور جن کے چھپے رہنے سے انسان اپنے دل کا سچا حال آپ نہیں جان سکتا، معلوم ہوسکیں۔

عام قاعدہ تو اس کے لئے یہ ہے کہ ہم خود اپنے آپ کو ان مذہبی اصولوں کو جو ہماری ہدایت کے لئے مقدس کتاب اللہ میں لکھے ہیں، جانچیں اور اپنی زندگی کو اس پاک شخص کی زندگی سے مقابلہ کریں جس نے یہ فرمایا کہ انما

بشرٌ مثلکم یُوحیٰ اِلیٰ اَنَّمَا اِلٰھُکُم اِلٰہٌ وَّاحِد (رسول اللہ نے فرمایا کہ "بلاشک میں تمہاری طرح انسان ہوں پس میرے پاس وحی آتی ہے (اور تمہارے پاس نہیں آتی) اور بے شک تمہارا معبود ایک ہے) اور جو اس درجہ کمال تک پہنچا جہاں تک انسان کا پہنچنا ممکن ہے اور جس کی زندگی ہماری زندگی کے لئے نمونہ ہے اور جو اپنی پیروی کرنے والوں کے لئے بلکہ تمام دنیا کے لئے بڑا ہادی اور بہت بڑا دانا استاد ہے۔ ان دونوں قاعدوں کے برتنے میں بڑی بڑی غلطیاں پڑتی ہیں۔ کچھ تو لوگوں کی سمجھ میں غلطیاں ہوتی ہیں اور کچھ آپس میں اختلاف رائے ہوتا ہے جو بن ہوئے رہ نہیں سکتا۔ اور کچھ زمانہ کے گزرنے سے ٹھیک ٹھیک حالت اور کیفیت ان واقعات کی جو گزرے معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس لئے برخلاف اگلے مسلمان مصنفوں کے صرف انہی قاعدوں کے بیان کرنے پر میں اکتفا نہیں کرتا بلکہ اور بھی قاعدے بیان کرتا ہوں جو انسان کو ٹھیک ٹھیک مطلوبہ راہ پر لے آتے ہیں۔

اپنے پوشیدہ عیبوں کے معلوم کرنے کا ایک عمدہ قاعدہ یہ ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ ہمارے دشمن ہم کو کیا کہتے ہیں۔ ہمارے دوست اکثر ہمارے دل کے موافق ہماری تعریف کرتے ہیں یا تو ہمارے عیب ان کو عیب ہی نہیں معلوم ہوتے اور یا ہماری خاطر کو ایسا عزیز رکھتے ہیں کہ اس کو رنجیدہ نہ کرنے کے خیال سے ان کو چھپاتے ہیں یا ایسی نرمی سے کہتے ہیں کہ ہم ان کو نہایت ہی خفیف سمجھتے ہیں۔ برخلاف اس کے دشمن ہم کو خوب ٹٹولتا ہے اور کونے کونے سے ڈھونڈھ کر ہمارے عیب نکالتا ہے۔ گو وہ دشمنی سے چھوٹی بات کو بہت بڑا کر دیتا ہے مگر اکثر اس کی کچھ نہ کچھ اصلیت ہوتی ہے۔

تا نباشد چیز کے مردم نگویند چیز ہا

(جب تھوڑی چیز ہوتی ہے تو اس کو بڑھایا جا سکتا ہے۔)

دوست ہمیشہ اپنے دوست کی نیکیوں کو بڑھاتا ہے اور دشمن عیبوں کو۔ اس لئے ہم کو اپنے دشمن کا زیادہ احسان مند ہونا چاہئے کہ ہم کو ہمارے عیبوں سے مطلع کرتا ہے۔ اگر ہم نے اس کے طعنوں کے سبب ان عیبوں کو چھوڑ دیا تو دشمن سے ہم کو وہی نتیجہ ملا جو ایک شفیق استاد سے ملنا چاہئے تھا۔

دشمن جو عیب صحیح یا غلط ہم میں لگاتا ہے ہمارے فائدہ سے خالی نہیں۔ اگر وہ ہم میں ہوتا ہے تو ہم اپنے عیب سے مطلع ہوتے ہیں اور اگر نہیں ہوتا تو خدا کا شکر کرتے ہیں کہ وہ عیب ہم میں نہیں۔ سچ ہے کہ

دشمن از دوست ناصح تر ست این جز نکوئی نہ گوید واین جز بدی نجوید

(دشمن دوست سے زیادہ ناصح ہے اس لئے کہ وہ (دوست) سوائے نیکی کے اور کچھ نہیں کہتا اور وہ (دشمن) سوائے برائی کے اور کچھ نہیں کہتا۔)

پلوٹارک کا دشمنی کے فائدوں پر جو مضمون ہے اس میں اس نے یہ بات لکھی ہے کہ دشمن جو ہم کو بدنام کرتے ہیں اس سے ہم کو ہماری برائیاں معلوم ہوتی ہیں اور ہماری گفتگو میں اور ہمارے چال چلن میں اور ہماری تحریر میں جو نقص ہیں وہ بغیر ایسے دشمن کی مدد کے کبھی معلوم نہیں ہوتے۔'

علیٰ ہٰذاالقیاس اگر ہم خود اپنے آپ کو سمجھنا چاہیں کہ ہم کیا ہیں تو ہم کو اسی بات پر غور کرنا چاہئے کہ جو لوگ ہماری تعریف کرتے ہیں اس میں سے ہم کس قدر کے مستحق ہیں اور پھر یہ سوچنا چاہئے کہ جن کاموں کے سبب سے وہ تعریف کرتے ہیں یا نہیں۔ اور پھر ہم کو یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ وہ نیکیاں جن کے سبب ہماری تعریف کرنے والے ہماری تعریف کرتے ہیں دراصل ہم میں کہاں تک ہیں۔ ان باتوں پر انسان کو بخوبی غور کرنا نہایت ضروری ہے کیوں کہ ہمارا یہ حال ہے کہ کبھی تو ہم لوگوں کی رایوں کو جو ہماری نسبت ہیں پسند کر کے اپنے تئیں بہت بڑا سمجھنے لگتے ہیں اور کبھی ان کو ناپسند کرتے ہیں اور جو کچھ ہمارا دل کہتا ہے اس کے مقابلہ میں ان تمام رایوں کو نہیں مانتے۔

ہم کو ایسی نیکی پر بھی جس کو ہم نے اپنے خیال میں نیک سمجھا ہے مگر درحقیقت اس کی نیکی مشتبہ ہے، زیادہ اصرار نہیں کرنا چاہئے بلکہ لوگوں کی رایوں کو بھی نہایت قدر و منزلت کرنی چاہئے۔ جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں اور جو عقلمند اور نیک دل ہیں اور جس طرح ہم نیک دلی سے بات کہتے ہیں اسی طرح وہ بھی نیک دلی سے ہم سے مخالفت کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ان اختلاف کرنے والوں نے صرف آزادی رائے اور اس دلی نیکی سے جس کے سرچشمہ کی سوت قدرت نے ہر ایک انسان کے دل میں کھولی ہے اختلاف کیا ہے یا کسی بیرونی دباؤ یا پابندی رسم و رواج اور تعصب اور تقلید نے ان کے دل کو پھیرا ہے کیونکہ اگر یہ پچھلی بات اختلاف رائے کا سبب ہو تو وہ نہایت بے قدر ہو جاتی ہے۔

جہاں ہم کو دھوکہ کھانے کا احتمال ہے وہاں ہم کو نہایت ہوشیاری اور بہت خبرداری سے کام کرنا چاہئے۔ حد سے زیادہ سرگرمی اور تعصب اور کسی خاص فرقہ کو یا کسی خاص رائے کے لوگوں کو برا اور حقیر سمجھنا، یہ ایسی باتیں ہیں جن سے ہزاروں آفتیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ فی نفسہ نہایت ہی بری ہیں گو کہ وہ ہم سے کمزور دل آدمیوں کو اچھی معلوم ہوتی ہیں مگر اس پر بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ایسے لوگ بھی دنیا میں ہیں جو دینداری اور نیکی کے لئے نہایت

مشہور ہیں مگر نہایت لغو اور نرے شیطانی اصولوں کو نیکی سمجھ کر اپنے دلوں میں اس کی جڑ گاڑ دی ہے۔ میں اس بات کو اقرار کرتا ہوں کہ میں نے آج تک کوئی ایسا عقلمند اور انصاف پسند شخص نہیں دیکھا جس میں پوری پوری یہ سب باتیں ہوں اور پھر بھی گناہ سے پاک ہو۔

اسی طرح ہم کو ان کاموں سے بھی ڈرنا چاہئے جو انسان کے کمزور دل کی قدرتی بناوٹ سے یا کسی خاص شوق سے یا کسی خاص تعلیم کے اثر سے یا کسی اور سبب سے ہوتی ہیں جس میں ہمارا دنیوی فائدہ ہے۔ ایسی حالت میں انسان کی سمجھ نہایت آسانی سے حق بات کی طرف سے پھر جاتی ہے اور اس کا دل غلطی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اور یہی باتیں ہیں جن کے سبب سے تعصب اور ہزاروں غلطیاں اور پوشیدہ برائیاں اور لامعلوم عیب انسان کے دل میں گھس جاتے ہیں جس کام کے کرنے میں عقل کے سوا اور جذبوں کی بھی ترغیب ہو اس کے کرنے میں عقلمند آدمی کو ہمیشہ ڈرنا اور ہمیشہ اس پر شبہ کرنا چاہئے کہ ضرور اس میں کوئی نہ کوئی برائی چھپی ہوئی ہوگی۔

ان اصولوں پر اپنے خیالوں کو جانچنا اور اپنے دل کو ٹٹولنا اور دل کے تاریک جذبوں کو ڈھونڈنا ہمارے لئے اس سے بڑھ کر کوئی چیز مفید نہیں ہے۔ اگر ہم اپنے دل میں ایسی مضبوط نیکی بٹھانی چاہیں جو قیامت کے دن ہمارے کام آوے۔ جس دن کہ ہمارے بھیدوں کو جاننے والا ہمارے دل کو جانچے گا جس کی عقل اور انصاف کی کچھ انتہا نہیں تو ان اصولوں پر چلنے سے بہتر ہمارے لئے کوئی راہ نہیں۔ ہمارے بانی اسلام نے جب ہم کو یہ سکھایا کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے ہمارے دل کے چھپے بھیدوں کو جانتا ہے تو اس نے کس خوبی اور خوبصورتی سے اس ریاکاری کی برائی ہم کو بتلا دی جس سے انسان دنیا کو دھوکہ دیتا ہے اور خود اپنے آپ کو ہی فریب میں ڈالتا ہے۔ داوڈؑ نے بھی اپنی مناجات میں اس ریاکاری کے خوف کو جس سے انسان خود اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے نہایت دلچسپ لفظوں میں ادا کیا ہے جہاں اس نے کہا ہے کہ —

'اے خدا مجھ کو جانچ، میرے دل کی تہہ کو ڈھونڈ، میرے خیالوں کو دیکھ، مجھ کو بخوبی پرکھ کہ مجھ میں کس برائی نے راہ کی ہے اور مجھ کو ایسی راہ پر لے چل جو ہمیشہ کو قائم رہے۔'

لفظ و معنی

رند - شرابی

بد - برا

دیندار	۔	مذہب پر عمل کرنے والا
تماش بینی	۔	تماشا دیکھنا
فریب	۔	دھوکہ
درحقیقت	۔	حقیقت میں
مقدس	۔	پاک
مناجات	۔	خدا سے منظوم دعا
پوشیدہ	۔	چھپا ہوا
ہادی	۔	ہدایت دینے والا
دانا	۔	جاننے والا، عقلمند
اکتفا	۔	قناعت
مطلع کرنا	۔	اطلاع دینا، جانکاری دینا
شفیق	۔	شفقت و محبت کرنے والا
ناصح	۔	نصیحت
نقص	۔	کمی
احتمال	۔	شک
مشتبہ	۔	شبہ سے بھرا ہوا

ABDIEL SOLUTIONS ABSOL PATNA

آپ نے پڑھا

- زیر نصاب مضمون میں سرسید احمد خاں نے ریاکاری کے صحیح مفہوم کی وضاحت کی ہے۔ عام طور پر اس عیب کا تجزیہ لوگ یوں کرتے ہیں کہ دل میں بات کچھ ہو اور ظاہر میں کچھ کہا جائے۔ لیکن ریا کا عیب اس حد تک محدود نہیں رہتا۔
- اکثر یہ ہوتا ہے کہ بھگنے والا خود مغالطے میں رہتا ہے اور اسے یہ بھی احساس نہیں ہو پاتا کہ وہ ریاکاری کر رہا ہے۔ ریاکاری کا تعلق صرف ظاہری عمل اور ردعمل سے نہیں ہے بلکہ اکثر یہ ہوتا کہ آدمی کسے شبہے یا وہم یا غلط فہمی کی وجہ سے ایسے ایسے اقدامات کرتا ہے جس کے کرنے پر خود اسے پتہ نہیں چلتا کہ وہ صحیح کر رہا ہے یا غلط۔ ریا اسی داخلی

ذہنی پیچیدگی کا نام ہے۔ کبھی دوست غلط تعریفیں کر کے شخصیت میں ریا کا عنصر ڈال لیتے ہیں اور کبھی دشمن خوبیوں کو عیب بنا کر ذہنی تناؤ میں گرفتار کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے پورے اعتماد اور تیقن کے ساتھ اچھائیوں کو ہی انجام دے پاتا۔ کسی کی شخصیت میں ریا کے داخل ہوجانے کی وجہ سے اس کا سارا عمل بے مقصد ہوجاتا ہے اور اس کے نزدیک نیک و بد کا مسئلہ نہیں ہوتا۔

- اس نفسیاتی کشاکش کے موقع پر اگر غور کیا جائے تو انسان کے دشمن دوست کے مقابلے میں کم نقصان دہ ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ دشمن عیب جوئی کرتا ہے لیکن دوست تو شدید مغالطے میں ڈال دیتا ہے۔ وہ اپنی جھوٹی محبت یا دکھاوے کی وجہ سے ہمارے ایسے عمل کی ستائش کر جاتا ہے جو حقیقتاً لائق تحسین نہیں ہوتا۔
- سرسید احمد خاں نے اس نفسیاتی کشاکش سے بچنے اور دوست و دشمن کے الگ الگ ہتھیاروں سے محفوظ رکھنے کے لئے کچھ ایسے اصول مرتب کئے ہیں جن پر چل کر ہم وہ اطمینان حاصل کر سکتے ہیں جن سے ہماری شخصیت کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ بہت سے جذبے ایسے ہوتے ہیں جو ہمیں عدل و انصاف برتنے کا موقع نہیں دیتے۔ تعصب حد سے بڑھی ہوئی سرگرمی اپنے اچھے کاموں کے اظہار کی بڑھی ہوئی لگن ہمارے اندر خفیہ طور پر ریاکاری کے اجزا پیدا کر لیتی ہیں۔

مختصر ترین سوالات

1. سرسید کی پیدائش کب ہوئی؟
2. سرسید کی والدہ کا نام کیا تھا؟
3. سرسید کی وفات کب ہوئی؟
4. سرسید کا کون سا مضمون آپ کے نصاب میں شامل ہے؟

مختصر سوالات

1. سرسید کی زندگی کے بارے میں پانچ جملے لکھیے۔
2. درج ذیل الفاظ کو جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ جنس ظاہر ہوجائے :

   موتی، کتاب، وقت، نام، قلم
3. مضمون کے بارے میں پانچ جملے لکھیے۔

طویل سوالات

1. سرسید کی ادبی خدمات پر ایک مضمون لکھیے۔
2. زیر نصاب مضمون 'ریا' کا مرکزی خیال پیش کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. سرسید کی تصنیفات کی ایک فہرست بنایئے۔
2. اپنے استاد سے سرسید کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیجیے۔
3. اصلاحی مضامین پر کلاس میں ایک مذاکرہ کیجیے۔

ڈاکٹر عبدالمغنی

ڈاکٹر عبدالمغنی ریاست بہار کے دانشوروں اور تنقید نگاروں میں ممتاز ہیں۔ عہد حاضر میں شعروادب اور فکرونظر کو وسعت اور شفافیت کے ساتھ پیش کرنے والوں اور ایک مخصوص تنقیدی اصول کو مقبول بنانے میں ڈاکٹر عبدالمغنی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے والد مولانا عبدالرؤف ایک معروف عالم دین تھے۔ ان کا تعلق ضلع اورنگ آباد (بہار) سے ہے، ڈاکٹر عبدالمغنی کی پیدائش وہیں 1934ء میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ آگے کی تعلیم کے لئے انہوں نے مدرسہ شمس الہدیٰ میں داخلہ لیا۔ یہاں سے انہوں نے عالم کی سند حاصل کی۔ مدرسہ کی تعلیم کے ساتھ انہوں نے عصری تعلیم کی طرف بھی توجہ دی اور انگریزی میں ایم اے کیا۔ ملازمت کا وقت آیا تو انگریزی کے لکچرر کی حیثیت سے پٹنہ یونی ورسٹی کے پٹنہ کالج میں ان کا تقرر ہوا۔ بعد میں ان کا تبادلہ بی این کالج میں ہوگیا۔ جہاں سے وہ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

پروفیسر عبدالمغنی نے شعروادب کی متعدد اصناف کے بارے میں اپنے مطالعات پیش کئے ہیں۔ اقبال ان کا خاص موضوع رہا ہے، وہ تقریباً بیس کتابوں کے مصنف و مؤلف ہیں۔ زندگی اور ادب کے حوالے سے وہ ایک مخصوص تعمیری نقطہ نظر کے حامل تھے اور انہوں نے اسے کامیابی کے ساتھ اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔ ان کی اہم ترین تنقیدی تالیفات میں جادۂ اعتدال، نقطۂ نظر، معیار و اقدار، تشکیل جدید، اقبال اور عالمی ادب وغیرہ ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی کی وفات پٹنہ میں 5رستمبر 2006ء میں ہوئی۔

ادب کی پہچان

ادب کو جانتے سبھی لوگ ہیں مگر پہچانتے بہت کم ہیں، ادب پڑھنے والوں کا حلقہ روز بہ روز بڑھتا جارہا ہے لیکن ادب سمجھنے والوں کا حلقہ اسی نسبت سے گھٹتا جارہا ہے۔ آج ناول، افسانہ یا رسالہ خاص کر ڈائجسٹ، ہر پڑھے لکھے آدمی کی میز پر مل جائے گا، مگر ان ادبی شکلوں کی قدر شناسی اس آدمی کے لئے بہت دشوار ہے، چنانچہ وہ ادب کے نام سے پڑھ تو لیتا ہے بازار میں چلتی ہوئی بہت سی چیزوں کو، لیکن یہ بھی نہیں جانتا کہ ان میں کون ادب ہے اور کون نہیں اور جو چیزیں واقعی ادب ہیں ان کے درمیان تنقیدی موازنہ اور ان کی باہمی خوبی وخامی کو سمجھنا تو اس کے لئے بالکل محال ہی ہے۔ اس صورت حال کے نتیجے میں آج ادب اور غیر ادب خلط ملط ہوکر رہ گئے ہیں۔

اس لئے بہت ضروری ہے کہ ادب کی پہچان پر گفتگو کی جائے۔ یہاں پہنچ کر ہمیں اپنی حقیقی مشکل کا احساس ہوتا ہے۔ گرچہ ادب کی تعریف وتشریح صدیوں سے ہوتی چلی آرہی ہے اور اس موضوع پر بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں۔ مگر آج تک یہ تعین کرنا دشوار ہے کہ واقعتاً ادب کیا ہے، اس کی کیا حدیں ہیں اور کیا صفتیں؟ اس سلسلے میں سب سے بڑا اور بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا کسی زبان میں لکھی جانے والی ہر علمی تحریر ادب ہے؟ کچھ لوگوں کا خیال یہی ہے کہ فلسفہ، معاشیات، دینیات اور اخلاقیات، تاریخ اور طبیعیات وغیرہ علوم وفنون میں مختلف موضوعات پر جو کچھ بھی ادبیت کے ساتھ لکھا جائے، وہ ادب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ادب درحقیقت ایک اسلوب، ایک طرز بیان کا نام ہے، اس کا کوئی خاص موضوع اور مواد نہیں ہے۔ چنانچہ ادب کی تاریخوں میں ادبی اسلوب میں لکھی ہوئی ہر قسم کی تحریروں کو ادب کے ذیل میں درج کیا گیا ہے۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ادب دراصل ایک خاص قسم کی تحریر کا نام ہے اور ادب کا صرف ایک خاص اسلوب ہی نہیں بلکہ ایک خاص مواد بھی ہے، یعنی ادب کے خام وسائل جو بھی ہوں مگر تخلیق کی شکل میں اس کا ایک مخصوص موضوع بھی ہے اور ہیئت بھی۔ بلکہ یوں کہئے کہ ادب کے کچھ خاص خاص موضوعات اور ہیئتیں ہیں، جن کا اظہار

کچھ متعین صنفوں میں ہوتا ہے، چنانچہ جو کچھ ان صنفوں میں لکھا جائے وہی ادب ہے اور جو کچھ ان صنفوں کے باہر ہے وہ ادب نہیں ہے۔ خواہ اس کے اندر کتنی ہی ادبیت پائی جائے، اس لئے کہ ادب ایک خاص شکل کا نام ہے، جیسے شاعری، ڈراما، ناول، افسانہ۔

اس نقطۂ نظر کے بھی دو مکتب فکر ہیں، ایک یہ کہ جو کچھ ادب کی مقررہ ہیئتوں میں لکھا جائے وہ ادب ہے۔ خواہ وہ جس معیار کا بھی ادب ہو۔ دوسرے یہ کہ ادب کی شکل میں نظر آنے والی ہر چیز ادب نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ادب صرف ایک بنی بنائی ہیئت کا نام نہیں، بلکہ یہ درحقیقت ایک خاص معیار ہے جو ادب کی کسی بھی ہیئت میں لکھنے والا خود ہی بناتا ہے۔ یعنی جب تک کسی تحریر میں تخلیقی انفرادیت نہ ہو وہ ادب صحیح اور پورے معنوں میں ادب نہیں ہے اور تخلیقی انفرادیت سے محروم تحریریں محض میکانکی اور مصنوعی ہیں۔ اس مکتب فکر کے مطابق رسمی، فرسودہ، سطحی اور سستی چیزیں ادب نہیں ہیں اور ادب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ تحریر میں تازگی، جدت، بلندی اور گہرائی ہو۔

ادب کا یہ آخری معیار بہت کڑا ہے اور اس تصور کے مطابق ادب کا دائرہ بہت ہی محدود ہو جاتا ہے لیکن اس معیار و تصور میں بھی مزید شدت پیدا کرنے والا ایک اور مکتب فکر ہے، وہ یہ کہ ادبی ہیئت کی تمام شرطوں اور تخلیق کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد بھی معیاری ادب قرار پانے کے لئے ضروری ہے کہ ایک تحریر اعلا سنجیدگی کی حامل ہو اور اس کے اندر تنقید حیات پائی جائے، یعنی مکمل اور کامل ادب وہ ہے جس میں بہترین فن کا اظہار بہترین فکر کے ساتھ کیا گیا ہو، جس میں اسلوب کی نفاست کے ساتھ ساتھ موضوع کی متانت بھی ہو، جس میں مواد کی ثقاہت اور ہیئت کی لطافت دونوں موجود ہوں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ادب کا ایک معیار متعین کرنا ہو تو ضروری ہوگا کہ ایک مکمل نمونہ ادب کی تعریف کی جائے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ادب کے دو اجزائے ترکیبی ہیں، ایک فکر، دوسرے فن اور ایک مکمل ادبی تخلیق اسی وقت بروئے کار آئے گی جب فکر اور فن دونوں ہی اعلیٰ درجے کے ہوں اور ان کے درمیان کامل ہم آہنگی بھی پیدا ہو جائے، اس طرح کہ دونوں ایک دوسرے میں پیوست اور ضم ہو جائیں اور اس ازدواج کے نتیجے میں ایک ناقابل تقسیم تخلیقی مرکب نمودار ہو، اور یہ مرکب زندگی اور ادب کی بہترین قدروں کا مظہر ہو، اس سے انسانی تہذیب کی جمالیات اور اخلاقیات دونوں کو فروغ ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس معیار پر پوری اترنے والی تحریر ہی ادب ہے اور اس سے کم تر جو کچھ ہے وہ ادب نہیں ہے؟ میرا خیال ہے کہ ایسا سمجھنا صحیح نہ ہوگا۔ زندگی کے کسی بھی کام کا معیار اس کے کمال کو ظاہر کرتا ہے، جب کہ دنیا کی ہر چیز درجۂ کمال پر نہیں ہوتی، بلکہ اس درجے سے نیچے بھی چیزوں کا وجود ہوتا ہے، جس سے انکار کرنا حقیقت کے خلاف ہوگا۔ لہذا معیارِ کمال کی نشان دہی کرتے ہوئے بھی وجود کی پہچان بالکل ضروری ہے۔ سب سے پہلی چیز کسی ہستی کی بنیادی تعریف ہے، اس کے بعد اس کی تکمیل کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا کام ادب کی نوعیت کا سراغ لگانا ہے۔ اس کے بعد اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کی نوبت آئے گی، ادب کی پہچان کے بعد اس کی پرکھ ہو سکے گی۔ جب تک ادب کے عناصر معلوم ہوں اس کے اوصاف کا پتہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ادب کو صرف دو حصوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت ہوگی، ایک عام ادب اور دوسرے خاص ادب۔ عام ادب کے ذیل میں ہر وہ تحریر آجائے گی جس کے اندر ادبیت پائی جاتی ہو، خواہ اس کا تعلق فلسفہ و حکمت سے ہو یا سیاست و معیشت اور دینیات و اخلاقیات سے، جب کہ خاص ادب صرف ان تحریروں کو کہا جائے گا جو کسی مخصوص تخلیقی ہیئت میں لکھی گئی ہوں، جیسے ناول، افسانہ، شاعری اور ڈراما کی صنفیں۔ اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ عام ادب ایک علمی چیز ہے جب کہ خاص ادب ایک فنی چیز ہے۔

اب جہاں تک علمی ادب کا تعلق ہے اس کی صرف ایک پہچان ہے، وہ یہ کہ اس کے اسلوب بیان میں ادبیت پائی جاتی ہو، اس کے طرزِ اظہار میں محاورات، امثال، تشبیہات و استعارات اور تلمیحات و کنایات کی چاشنی ہو، مختصر یہ کہ ایک اچھی طرح لکھی ہوئی، دلچسپ اور خیال انگیز، موثر اور دل نشیں نثر ہو۔ دوسری طرف فنی ادب کی پہچان بس یہ ہوگی کہ فن کی جس صنف میں اس کی تخلیق کی گئی ہو اس کی مقررہ ہیئت کے مسلمہ اصول و قواعد کی پابندی اس میں بنیادی طور سے کی گئی ہو، خواہ اس پابندی کے علاوہ اس میں جدت و انفرادیت کا کوئی نشان نہ ہو اور خواہ ایک انفرادی اجتہاد کے ذریعے قائم شدہ روایت کی توسیع و تجدید کا کتنا ہی سامان کیا گیا ہو۔ ادب کی شکل میں پائی جانے والی اور فنی ضوابط پر پوری طرح اترنے والی ہر چیز بہ ہر حال ادب ہے، خواہ تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ہم اس چیز کی اچھائی کا اعتراف کریں یا اس کی برائی پر اعتراض کریں۔

اس طرح ادب کی ایک بنیادی اور عمومی تعریف اور پہچان ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ سوال پھر بھی رہ جاتا ہے کہ اگر ادب ایک ذوقی اور تخلیقی چیز ہے تو کیا ہم ادب کی صرف اس پہچان پر اکتفا کرلیں اور اس کی پرکھ کی طرف کوئی

توجہ نہ دیں؟ یہ سوال بہت اہم ہے، اس لئے کہ پڑھنے والوں سے صرف ادب پڑھنے کی توقع نہیں کی جاتی ہے بلکہ یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ وہ ادب کا تنقیدی مطالعہ کریں گے۔ اس سلسلے میں ادب پر خاص کر ادیب کے نقطہ نظر سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ ادب کے کسی بھی معنی اور صنف پر لکھنے والوں کے بارے میں اصولی طور پر یہ فرض کیا جاتا ہے کہ وہ تخلیقی جس کے ساتھ ہی ساتھ ایک تنقیدی شعور بھی رکھتے ہیں، اس لئے کہ ادب کی تخلیق بہ ہر حال ایک ذمے داری کی بات ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ جو شخص دنیا کے سامنے ادب پیش کرنا چاہتا ہے وہ صرف لوگوں کے سامنے اپنا دل کھول کر نہیں رکھ دے گا، بلکہ اپنے منتخب کیے ہوئے موضوع، اسلوب اور ہیئت کے بنیادی تقاضوں کے پیش نظر وہ شخص چھان پھٹک اور سوچ بچار کر کے کچھ خاص نکتے ایک مخصوص انداز میں بیان کرے گا، اس لئے کہ ادب بہ ہر حال محض زبان سے بالیدہ تر ایک اظہار خیال کا نام ہے، اور ہر تحریر ادب نہیں ہے، خواہ ادب کی جو بھی تعریف کی جائے، ادب کے کچھ نہ کچھ حدود اور خواص تو ہوں گے ہی، جن کی بنیاد پر ادب کو غیر ادب سے ممتاز کیا جا سکے گا۔ لہٰذا ضروری ہوگا کہ جو چیز غور و فکر سے لکھی گئی ہے اسے غور و فکر سے پڑھا اور سمجھا بھی جائے۔ اس طرح ادب کی پہچان کے ساتھ ساتھ پرکھ بھی کچھ نہ کچھ کرنی ہی پڑے گی اور جب پرکھی ہوئی پہچان کا معاملہ ہوگا تو ہمیں غیر معیاری اور سطحی چیزوں سے صرف نظر کر کے معیاری اور عمدہ چیزوں کی قدر شناسی کرنی ہی پڑے گی، تاکہ ادب کا معیار لکھنے اور پڑھنے والوں کے درمیان بہ ہر حال قائم رہے۔

لفظ و معنی

دانشور	۔	پڑھا لکھا ہونا، عقلمند، ذہین
تنقید نگار	۔	وہ شخص جو تنقید لکھتا ہو، جانچ پرکھ کرنے والا
ممتاز	۔	سب سے الگ، دوسروں سے جدا ہونا، انتخاب کیا گیا، افضل
عہد حاضر	۔	وہ زمانہ جو چل رہا ہو، موجودہ دور
شعر و ادب	۔	شاعری اور وہ تخلیق جو ذہنی آسودگی پیدا کرے
فکر و فن	۔	سوچ، خیال، تخلیقی سوچ

وسعت - پھیلاؤ

شفافیت - صفائی، سادگی

مخصوص - خاص

اصول - قانون، معیار

مقبول - ہردلعزیز، لوگوں میں پسند کیا جانے والا

موازنہ - ایک سے دوسرے کا مقابلہ کرنا

باہمی - آپسی، باہم، ایک دوسرے کے ساتھ

خلط ملط - ملا جلا ہونا، ایک دوسرے میں الجھ جانا

تعین - کسی چیز کی حد مقرر کرنا

خام وسائل - وہ ذرائع جو معاون ہوں

ہیئت - بناوٹ

تخلیقی انفرادیت - فن کار کی اپنی پہچان، اس کی اپنی طرز

لطافت - خوبصورتی، نزاکت

ناقابل تقسیم - جس کو بانٹا نہ جاسکے، ٹکڑے ٹکڑے نہ کیا جاسکے

قدروں کا مظہر - خوبیوں کا مالک ہونا

تہذیب - اپنی روایت سے جڑا ہونا

اخلاقیات - اطوار کو سدھارنے والی اچھائیاں

ہستی - زندگی، شخصیت، وجود

نوعیت - قسم

اسلوب - طریقہ، طرز

ضوابط - قانون، اصول

ذوق - رجحان

بالیدہ - پختہ، تجربہ کار

صرفِ نظر - توجہ سے ہٹانا، درگزر کرنا، کنارے کرنا

آپ نے پڑھا

- ہم ادب کی پہچان کس طرح کریں ایک فن کار اپنے فن کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ وہ کتنا ادبی ہے۔ عبدالمغنی کا مضمون ادب اور اس کی پہچان میں مکمل زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ ہر تحریر ادبی نہیں ہوتی اور ہر ادب کا معیاری ہونا بھی لازمی ہے۔ ایک فن کار اپنا فن یا فنی نمونہ لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس میں وہ کس موضوع کو پیش کر رہا ہے اور کس انداز میں پیش کر رہا ہے یہ بھی باتیں شامل ہوتی ہیں۔
- وہ فنی نمونہ جسے پڑھ کر ہمارے اندر سرور اور انبساط محسوس ہو اور ہم آسودگی کا احساس کریں وہ ادب میں شامل ہوتا ہے۔ ادب انسان کی ذہنی اور روحانی تربیت کرتا ہے یہ وہ شئے ہے جو تہذیب انسانی بھی سناتا ہے اور ہمیں مہذب بنانے میں معاون بھی ہوتا ہے۔ اس طرح ادب ہمارے لئے تاریخی دستاویز بھی ہوتا ہے اور ہماری رہنمائی مستقبل میں بھی کرتا ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. نصاب میں شامل مضمون 'ادب کی پہچان' کے مضمون نگار کون ہیں؟
2. ڈاکٹر عبدالمغنی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
3. ڈاکٹر عبدالمغنی کی دو کتابوں کے نام لکھیے۔
4. ڈاکٹر عبدالمغنی نے کس مدرسے میں کہاں تک تعلیم حاصل کی؟
5. ڈاکٹر عبدالمغنی نے اپنی ملازمت کا آغاز کس کالج سے کیا؟

مختصر سوالات

1. ڈاکٹر عبدالمغنی کی تنقید نگاری پر پانچ جملے لکھیے۔
2. 'ادب کی پہچان' پر مختصر روشنی ڈالیے۔
3. 'ادب کی پہچان' کے حوالے سے ادب کی مختصر تعریف لکھیے۔

طویل سوالات

1. ڈاکٹر عبدالمغنی کی تنقید نگاری پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
2. 'ادب کی پہچان' کے حوالے سے ادب کے تعلق سے مختلف نظریات بیان کیجیے۔
3. اردو ادب میں تنقیدی روایات کا جائزہ لیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. ڈاکٹر عبدالمغنی کی مطبوعات کی ایک فہرست تیار کیجیے۔
2. ڈاکٹر عبدالمغنی کی شخصیت اور ادبی خدمات پر ایک مذاکرہ کیجیے۔

ABDIEL SOLUTIONS ABSOL PATNA

ہندوستانی آئین کے معمار
ڈاکٹر بھیم راؤ امبید کر

ہندوستان کے اکثریتی سماج میں کچھ لوگ پسماندہ طبقے کے مانے جاتے تھے۔ سیکڑوں برسوں سے سماج میں نہ کوئی ان کی فکر کرتا تھا اور نہ ان سے پیار کرتا تھا۔ بلکہ وہ لوگ نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور انہیں اچھوت کہا جاتا تھا۔

اونچی ذات کے لوگ ان اچھوتوں کو اپنے درمیان رہنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ وہ ان کے کنوؤں کے پانی کو نہیں چھو سکتے تھے، نہ ان کے تالابوں سے پانی بھر سکتے تھے۔ اچھوت مندر میں نہیں جاسکتے تھے۔ نہ کسی اسکول میں تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ ان کا کام سڑکوں، گلیوں میں جھاڑو لگانا، جوتے بنانا یا جوتوں کی مرمت کرنا، بید کے ٹوکرے بنانا یا مردہ جانوروں کی کھال اتارنا تھا۔

سیکڑوں برسوں تک یہ اچھوت غریبی، جہالت، سخت جانفشانی اور ان گنت تکلیفوں کی زندگی جیتے رہے۔

ایسے ہی ایک اچھوت، مراٹھی زبان بولنے والے مہار خاندان میں ڈاکٹر بھیم راؤ امبید کر 14 / اپریل 1891 کو مہو، سنٹرل انڈیا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام رام جی مالوجی سکپال اور والدہ کا نام بھیم بائی تھا۔ وہ اپنے والدین کی چودہویں اور سب سے چھوٹی اولاد تھے۔ سب لوگ پیار سے انہیں بھیما کہا کرتے تھے۔ انہوں نے بھیم راؤ کے نام سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ اپنے دادا مالوجی کی طرح سے ان کے والد رام جی سکپال برطانوی سرکار کی فوج میں ملازم تھے۔

ان دنوں برطانوی سرکار نے فوج میں کام کرنے والوں کے لئے تعلیم کو لازمی قرار دے رکھا تھا۔ سرکار ان نوجوانوں کی عورتوں اور بچوں کی تعلیم کے لئے اسکول چلاتی تھی۔ مالوجی اور رام جی دونوں ایسے خوش قسمت مہار تھے جن کو تعلیم کا فائدہ پہنچا۔

بھیم راؤ کی عمر ابھی دو برس کی ہی تھی کہ ان کے والد فوج کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ 14 برس تک رام جی فوجی اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ سبکدوشی کے وقت ان کا عہدہ دوسری گرینڈیرز میں صوبے دار میجر کا تھا۔ یہ خاندان سنٹرل انڈیا کو چھوڑ کر کونکن علاقہ میں داپولی مقام پر جابسا۔ یہیں پانچ سال کی عمر میں امبیڈکر کا اسکول میں داخلہ ہوا۔ جلد ہی ان کے والد رام جی کو ستارا میں نوکری مل گئی۔ اس طرح یہ خاندان ستارا چلا گیا۔ یہاں پر بھیم راؤ کا چھاؤنی میں گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ ہوگیا۔

بھیم راؤ ابھی چھ سال کے ہی تھے کہ ان کی ماں بھیما بائی کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ رام جی کی بہن نے اس خاندان کی دیکھ بھال شروع کردی۔

بھیم راؤ کو اب اس کڑوی سچائی کا احساس ہونے لگا تھا کہ وہ پیدائشی طور پر اچھوت ہیں۔ آگے چل کر ایسے ایسے واقعات ان کی زندگی میں رونما ہوئے کہ انہیں اپنے مذہب اور ہم مذہبوں سے نفرت ہونے لگی۔

ستارا میں تعلیم کے دوران انہوں نے اپنے نام کے آگے امبیڈکر لکھنا شروع کیا۔ دراصل بھیم راؤ کے دادا، پڑدادا کونکن علاقے میں امباواڈے کے رہنے والے تھے۔ مراٹھی زبان بولنے والے لوگوں کی روایت ہے کہ وہ اپنی ذات کے ساتھ اپنے رہائشی مقام کا نام لگاتے ہیں۔ چنانچہ سکپال کے ساتھ بھیم راؤ کو دوسرا سرنیم امباواڈیکر ملا۔ جسے بولنے میں آسانی کے لئے اسکول کے رجسٹر میں امبیڈکر لکھ دیا گیا۔

تعلیم کے معاملے میں شروع میں تو بھیم راؤ سنجیدہ نہیں تھے لیکن آگے چل کر انہیں جب تعلیم کی اہمیت کا احساس ہونے لگا تو انہوں نے اپنی تعلیم پر دھیان دینا شروع کیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب رام جی کی ستارا والی نوکری ختم ہوگئی اور ان کا خاندان بمبئی منتقل ہوگیا۔ بمبئی کے ایلفنسٹن ہائی اسکول کا ماحول، جس میں بھیم راؤ پڑھتے تھے، پرسکون نہ تھا۔ یہ اسکول سرکاری تھا لیکن یہاں بھی بھیم راؤ کے ساتھ ذات پات کا بھید بھاؤ کیا جاتا تھا۔ صرف اسکول کے طلبہ ہی انہیں حقارت اور نفرت کی نظر سے نہ دیکھتے تھے بلکہ اساتذہ کا سلوک بھی ویسا ہی تھا۔ لیکن بھیم راؤ خاموشی کے ساتھ اپنی بے عزتی برداشت کرتے رہے۔ ان کی تعلیم جاری رہی اور انہوں نے 1908 میں میٹرک کا امتحان پاس کرلیا۔ مہار ذات والوں کے لئے یہ بڑے فخر کی بات تھی۔ اس لئے ان لوگوں نے اس خوشی کے اظہار کے لئے ایک جلسہ کیا اور بھیم راؤ کو مبارک باد دی۔ اس سے بھیم راؤ کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ انہوں نے اب ایلفنسٹن کالج میں داخلہ لیا اور 1912 میں اسی کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد بڑودہ اسٹیٹ

سے تعلیمی وظیفے پر وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے امریکہ چلے گئے اور کولمبیا یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ انہوں نے معاشیات میں اسی یونی ورسٹی سے ایم اے پاس کیا۔ اس کے بعد 1916 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال وہ انگلینڈ چلے گئے اور لندن اسکول آف اکنامکس میں داخلہ لے لیا۔ اسی کے ساتھ ہی وہ اکنامکس میں ایم ایس سی اور بیرسٹری کی تیاری کرتے رہے۔ لیکن 1917 میں ان کا یہ تعلیمی سلسلہ اس وقت رک گیا جب بڑودہ اسٹیٹ سے ملنے والا وظیفہ، جو ایک خاص مدت کے لئے تھا، بند ہوگیا۔ نتیجتاً انہیں ہندوستان واپس آجانا پڑا۔

ہندوستان واپس آکر انہوں نے پروفیسر آف کامرس اور اکنامکس کی حیثیت سے سیڈی ہام (Sydeham) کالج میں ملازمت شروع کردی۔ اس عہدے پر 1918ء سے 1920ء تک وہ کام کرتے رہے۔ اس دوران انہوں نے اپنی تنخواہ کے کچھ روپے بچا کر محفوظ کرلئے تھے اور کچھ دوسرے مخلصین نے امداد کی جس کی بدولت وہ دوبارہ 1920ء میں انگلینڈ چلے گئے اور اپنی ادھوری تعلیم پوری کی۔ انہوں نے 1921ء میں ایم ایس سی اور 1923ء میں ڈی ایس سی کی ڈگریاں حاصل کیں اور بیرسٹری بھی پاس کرلی۔ اس کے بعد ہندوستان واپس آگئے۔

ہندوستان واپس آکر انہوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور اس وقت سے وہ سماجی اصلاح اور سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگے۔ اس دوران انہوں نے صحافت سے بھی خود کو جوڑا۔ اصلاح کے لئے انہوں نے کئی سیاسی اور سماجی تنظیمیں قائم کیں اور آخر کار انہوں نے اچھوت سمجھی جانے والی ذاتوں میں ایک زبردست انقلاب پیدا کردیا جس کے اثرات آج واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

انہوں نے اچھوتوں کو یہ صلاح دی کہ "ہم اس وقت تک کوئی ترقی نہیں کرسکتے جب تک ہم تین مرحلوں میں اپنے اندر کی صفائی نہیں کرتے۔ ہمیں اپنے عام اخلاقی برتاؤ کو اوپر اٹھانا ہوگا۔ اپنے تلفظ کو سدھارنا ہوگا اور خیالات کو نئی طاقت دینی ہوگی۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ عہد کرلیں کہ آپ مردہ یا سڑے ہوئے جانوروں کا گوشت نہیں کھائیں گے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے درمیان سے اونچ نیچ کے بھید بھاؤ ختم کردیں۔ آپ عہد کیجیے کہ آپ بچے کھچے اور پھینکے ہوئے ٹکڑے نہیں کھائیں گے۔ ہم خود صرف اسی صورت میں اوپر اٹھ سکتے ہیں اگر ہم اپنی مدد آپ کریں۔ اپنی عزت نفس دوبارہ حاصل کریں اور اپنی طاقت کو جانیں"۔

بھیم راؤ نے جو تحریک چلائی اس کی اونچی ذات کے لوگوں کی طرف سے زبردست مخالفت ہوئی۔ لیکن انہوں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ انہوں نے قانونی طور پر بھی مخالفوں کی مخالفت کا جواب دیا اور وہ جس تحریک یا مشن کو

لے کر چلے تھے، اس میں کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے ملک وقوم کی اہم خدمات بھی انجام دیں۔ اس لئے ان کا شمار جدید ہندوستان کے معماروں میں ہوتا ہے۔

بھیم راؤ امبید کر کے کارناموں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ وہ عملی سیاست کے میدان میں بھی کودے اور کامیاب رہے۔ چنانچہ اس دور کے اہم سیاسی رہنماؤں مثلاً گاندھی جی اور نہرو جی سے بھی ان کے نزدیکی مراسم رہے۔ چنانچہ آزادی کے بعد جب ملک کی آئین سازی کا مرحلہ درپیش آیا تو دستور ساز کمیٹی میں وہ صدر کے عہدے پر فائز کیے گئے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ جب ان کی عمر چودہ برس تھی اور وہ پانچویں درجے کے طالب علم تھے تو ان کی شادی 9 برس کی لڑکی رامابائی سے ہوئی تھی۔ رامابائی کے انتقال کے بعد انہوں نے ایک اونچی ذات کی تعلیم یافتہ خاتون سے شادی کی۔

بھیم راؤ امبید کر ہندوستانی سماج میں چھوا چھوت کے رواج سے بہت ہی برہم اور بیزار تھے۔ اس لئے انہوں نے بدھ مذہب قبول کرلیا۔ ان کے اس قدم سے متاثر ہوکر دوسرے اچھوت طبقہ کے لوگوں نے بھی کثیر تعداد میں اپنا مذہب تبدیل کرلیا اور بودھسٹ ہوگئے۔ آگے چل کر وہ صرف اچھوتوں کے رہنما ہی نہیں رہے بلکہ ہندوستانی قوم کے رہنما سمجھے جانے لگے۔ وہ بودھ مذہب کے ماننے والوں میں بھی احترام کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ مذہبی تقاریب اور تقاریر کے سلسلے میں انہیں ان ممالک سے بھی دعوت نامے ملنے لگے جہاں بودھوں کی کافی تعداد ہے۔ بہت سارے اعزازات سے بھی نوازے گئے۔ ہندوستان کے سب سے بڑے اعزاز 'بھارت رتن' سے نوازے گئے۔

5 دسمبر 1956ء کی رات ڈاکٹر بھیم راؤ امبید کر سونے کے لئے بستر پر گئے تو نیند ہی میں وفات پاگئے۔ بودھ دھرم کے ماننے والے کہتے ہیں انہیں نروان مل گیا۔

ڈاکٹر بابا صاحب بھیم راؤ امبید کر نے زندگی بھر انتھک کوششیں کیں۔ ان کا مقصد تھا کہ پسماندہ طبقات کو بیدار کرنا، اٹھانا اور ہندوستانی سماج میں برابری اور بھائی چارگی پیدا کرنا۔ ڈاکٹر امبید کر نے ہمارے ملک کو وہ دستور دیا جو مذہب، ذات، عقیدہ اور جنس کے امتیاز کو ختم کرتا ہے اور تہیہ کرتا ہے کہ ملک کے تمام لوگوں کو یکساں مواقع فراہم کرے گا۔ یہ دستور مرد مرد کے درمیان اور عورت اور مرد کے بیچ مساوات قائم کرتا ہے۔ اس میں عام لوگوں کو

شادی بیاہ، طلاق، گود لینے، وراثت اور تعلیم کے حقوق دیئے گئے ہیں۔

اس طرح بھیم راؤ امبیڈکر نے ہندوستان کی دستور سازی میں ایک اہم اور تاریخی کردار ادا کیا۔ علاوہ ازیں دستور ہند میں سیکولرزم کا تصور پیش کر کے ہندوستان کے کثیر مذہبی اور کثیر لسانی معاشرے میں مساوات پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی جو ہندوستانی جمہوریت کے روشن مستقبل کی ضامن ہے۔

ماخوذ

لفظ و معنی

پسماندہ طبقہ	۔	پچھڑی ہوئی آبادی کے لوگ
حقارت کی نظر سے	۔	کسی کو نیچی نگاہ سے دیکھنا، ذلیل اور کم تر سمجھنا
جانفشانی	۔	محنت، مشقت
اچھوت	۔	جن کو چھونے کے لائق بھی نہیں سمجھا جائے
ملازمت	۔	نوکری
روایت	۔	کوئی رواج جو بہت زمانے سے چلا آ رہا ہو
حوصلہ افزائی	۔	حوصلہ بڑھانا، دلجوئی کرنا
وظیفہ	۔	تعلیم کے لئے امدادی رقم، اسکالرشپ
مخلصین	۔	خلوص والے، ہمدرد
تنظیم	۔	کوئی کام کرنے کے لئے بنایا گیا ادارہ
معمار	۔	بنانے والے
برہم	۔	ناراض
بیزار	۔	پریشان
احترام	۔	عزت
اصلاح	۔	سدھار، بہتری
منتقل	۔	ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جانا

معاشیات - اکونومکس، مادی وسائل اور ذرائع سے متعلق ایک شعبہ علم

مراسم - تعلقات

رہنما - لیڈر

آپ نے پڑھا

- ہندوستان کے اکثریتی فرقہ میں صدیوں سے ایک سماجی برائی چلی آرہی ہے جس کا نام چھوا چھوت ہے۔ اکثریتی فرقے کے اونچی ذات کے لوگ نیچی ذات کے لوگوں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے ہیں، یہاں تک کہ ان کو اپنے پاس سے گزرنے کی بھی اجازت نہیں دیتے ہیں۔ نہ انہیں مندر میں پوجا کرنے دیتے ہیں، نہ ہی اپنے کنویں سے پانی بھرنے دیتے ہیں۔
- ایسے ہی سماج میں بھیم راؤ امبیڈکر کی پیدائش ہوئی تھی۔ انہیں بھی طرح طرح کی ذلتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایسے حالات سے ان کے والد اور دادا کو بھی گزرنا پڑا تھا۔
- امبیڈکر حالات کے آگے جھکے نہیں، بلکہ انہوں نے حالات کو بدلنے کی کوشش کی تاکہ حقارت کی نگاہ سے دیکھی جانے والی نیچی ذاتوں کو حق اور انصاف ملے۔ اس کے لئے وہ مسلسل کوشش کرتے رہے اور لڑائی لڑتے رہے۔ ان کا ایک بہت بڑا کام ہندوستان کی دستور سازی ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. بھیم راؤ امبیڈکر کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟
2. بھیم راؤ امبیڈکر کے والدین کے نام لکھیے۔
3. بھیم راؤ کے والد فوج میں کس عہدے سے سبکدوش ہوئے؟
4. بھیم راؤ کی شادی کس عمر میں اور کس سے ہوئی؟
5. بی۔ اے کرنے کے لئے بھیم راؤ نے کس کالج میں داخلہ لیا؟
6. بدھ مذہب میں 'نروان' کا کیا تصور ہے؟

SOLUTION ABSOL PATNA

مختصر سوالات

1. اسکول میں بھیم راؤ کے ساتھ طلبہ اور اساتذہ کا سلوک کیسا تھا؟
2. بھیم راؤ کا خاندان ممبئی جا کر کیوں بس گیا؟
3. بھیم راؤ کے حصول تعلیم پر پانچ جملے لکھیے۔
4. بھیم راؤ امبیڈکر کی آئینی خدمات کو مختصراً بیان کیجیے۔

طویل سوالات

1. بھیم راؤ امبیڈکر کی سوانح لکھیے۔
2. ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی آئینی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
3. آزاد ہندوستان کے معاشرتی انقلاب میں امبیڈکر کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی شخصیت پر طلبہ کے ساتھ ایک مذاکرہ کیجیے۔
2. ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی سیاسی، آئینی اور معاشرتی خدمات کی ایک فہرست تیار کیجیے۔

لطف الرحمٰن

ان کا اصل اور ادبی دونوں نام لطف الرحمٰن ہے۔ ان کی پیدائش چھپرہ ضلع کے بنیار پور قصبہ میں 1941 ء میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام مولوی عبدالغفور مرحوم تھا۔ اور والدہ کا نام بی بی آمنہ خاتون تھا۔ ان کا آبائی وطن موضع ریونڈھا ضلع دربھنگہ تھا اور نانیہال بنیار پور تھا جہاں آپ کی پیدائش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بنیار پور میں ہی ہوئی۔ سن شعور کو پہنچے تو چند سال ریونڈھا میں بھی رہے۔ لطف الرحمٰن بچپن سے ہی ذہین تھے اس لئے اعلیٰ تعلیم حاصل کیا اور ڈبل ایم اے اور پی ایچ ڈی بھی کیا۔ یہاں تک کہ ایم اے میں گولڈ میڈل بھی حاصل کیا۔ انہوں نے اپنے تدریسی خدمات کا آغاز بھاگلپور یونی ورسٹی سے کیا اور صدر شعبۂ اردو بھاگلپور یونی ورسٹی کے عہدہ پر پہنچ کر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

لطف الرحمٰن کو سیاست سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ چنانچہ بھاگلپور اسمبلی حلقہ سے ایک بار قانون ساز اسمبلی کے لئے منتخب بھی ہوئے اور راشٹریہ جنتا دل سرکار میں کابینہ درجہ کے وزیر بھی ہوئے۔

آپ کو طالب علمی کے زمانے سے ہی مضامین نویسی اور شعروشاعری سے فطری دلچسپی تھی۔ تنقید، افسانہ نگاری اور شاعری آپ کے مخصوص موضوعات رہے ہیں۔ آپ کی شاعری کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ تازگی برگ نوا (مجموعہ غزل)، بوسۂ نم (مجموعہ غزل)، صنم آشنا (مجموعہ نظم)۔ ان کے علاوہ تنقید کے موضوع پر ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں جدیدیت کی جمالیات، نقد نگاہ، نثر کی شعریات، راسخ عظیم آبادی، تعبیر وتنقید اور شہر وفا وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شعری تخلیق اور دیگر تخلیقی عمل آج بھی جاری ہے۔

اردو ڈراما نگاری اور آغا حشر

اس مسلمہ حقیقت کے باوجود کہ آغا حشر کے بغیر اردو ڈرامے کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی، آغا حشر کی فن کارانہ شخصیت تضاد کا شکار رہی ہے۔ نقادوں کی ایک جماعت ان کو اردو کا شیکسپیئر اور دوسری عامیانہ اور سطحی مذاق کا تخلیق کار سمجھتی ہے۔ اس تضاد آرا کا بنیادی سبب اردو تنقید کی روایتی کج بینی تنگ نظری اور تعصب ہے یہ ایک معروضی سچائی ہے کہ آغا حشر کے نقادوں نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ احتشام حسین لکھتے ہیں:

'اگر وہ سستی شہرت سے بچ کر ڈرامے لکھتے اور زندگی کی انفرادی اور سماجی کشمکش کی بنیادوں پر اپنی ڈراما نگاری کی عمارت کھڑی کرتے ہیں تو حشر کا نقش تاریخ ادب پر اور گہرا ابھرتا ہے اور وہ ان نقائص کا شکار نہ ہوتے جو پارسی اسٹیج نے انہیں ورثے میں دیا۔'

وقار عظیم لکھتے ہیں:

'جس طرح یہ کمپنیاں بے شمار ہیں، اسی طرح ڈراما لکھنے والوں کی تعداد بھی انگنت ہے لیکن ان میں سے اکثر میں نہ صحیح ذوق ہے نہ صحیح علمی استعداد۔ اس لئے ڈراموں میں عموماً مذاق عام کی تسکین کی کوشش کی گئی ہے۔'

یہ دونوں رائیں انتہا پسندانہ ہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ آغا حشر کی فنکارانہ انفرادیت کا تجزیہ کرتے ہوئے ان نقادوں نے تخلیق کے زمانی پس منظر اور آغا حشر تک پہنچنے والی ڈراما کی روایت کو نظر انداز کر دیا۔

یہ ایک کائناتی صداقت ہے کہ ہر ادب اپنی عصری حسیت اور تہذیبی روایت کا آئینہ دار ہوتا ہے عظیم ادب کی ایک اہم پہچان یہ بھی ہے کہ وہ عصری حسیات و کیفیات کی تنقیدی آئینہ داری کے ساتھ ساتھ بعض ایسی صداقتوں کا عکاس بھی ہوتا ہے جو ماورائے عصر ہوتی ہیں یعنی ایسے ادب میں عصریت ابدیت سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ تخلیق کا زمانی و مکانی منظر و پس منظر سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے کسی بھی فنی تجربے کی عصری و ابدی

قدروں کا عرفان و شعور اس کی عصری حسیات اور تہذیبی اقدار کی بنیاد پر ہی ممکن ہے سنگ بنیاد کی اہمیت و حیثیت کو نظر انداز کر کے تنقیدی مطالعے کی دیوار تا ثریا بھی گئی تو کج ہی رہے گی۔ اردو تنقید نے آغا حشر کے مطالعہ میں اس کی کج روی کا ثبوت دیا ہے۔

آغا حشر کی فنی انفرادیت اور امتیاز کے تعین کے لئے اس حقیقت کو نظر انداز کرنا صحت مند تنقیدی رویہ نہیں ہوگا کہ آغا حشر کے قبل تک سنسکرت ڈراما نگاری کی مستحکم روایت کے باوجود اردو تمثیل نگاری فنی و فکری لحاظ سے معتبر و مستحکم نہ تھی یعنی اردو نے سنسکرت ڈراما نگاری کی دیرینہ عظیم الشان روایتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا حالانکہ سنسکرت سے فارسی اور اردو میں جمالیاتی روایت کی درآمد بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔

اس کے باوجود اردو تمثیل داستانی ماحول و معاشرے اور روایات و جمالیات سے زیادہ متاثر رہی لکھنؤ کے شاہی اسٹیج اور عوامی اسٹیج کا غالب رجحان یہی تھا اس وقت کے اردو ڈراموں میں بالعموم پرستان کی فضا اور پریوں اور شاہزادوں کی تخیلی اور غیر ارضی کہانیاں پیش کی جاتی تھیں۔ مکالموں میں پر تکلف مقفی اور مسجع زبان کا التزام کیا جاتا تھا۔ مکالموں کے درمیان گیت اور غزل کی کثرت ہوتی تھی ڈراما کا بنیادی مقصد عوامی ذوق کی تسکین اور حصول زر تھا۔ ڈراما نگاری کی حد تک تفنن طبع کو حاصل فن سمجھا جاتا تھا۔

فن کے جمالیاتی تقاضوں کی تکمیل کا بنیادی مقصد بے خبری کا شکار تھا جیسا کہ فی زمانہ فلموں کا حال ہے بنیادی مقصد سستی فلموں کے ذریعہ عوام الناس کے ذوق کی تکمیل اور تجارت اور منافع کا حصول ہے۔ اس مقصد کے لئے ہندوستان کی دیرینہ تہذیبی اور ثقافتی قدروں کو فیشن پرستی، مادیت پسندی اور جدت پسندی کے نام پر قربان کیا جا رہا ہے جس کی انتہا کسی بھی عام فلم میں دیکھی جا سکتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان فلموں کو حقیقی زندگی سے دور کا بھی رابطہ و واسطہ نہیں ہے۔ مگر حصول زر کے لئے ایسی فلمیں بنے بنائے فارمولوں کے تحت تیزی کے ساتھ ڈھل رہی ہیں۔ آغا حشر کے زمانے میں بھی ڈراما کمپنیوں کا مقصد حصول زر اور تجارت تھا۔

آغا حشر کی ڈراما نگاری کا آغاز 1901ء میں ہوا۔ ان کے بہت قبل سرسید کی علی گڑھ تحریک پوری طاقت و توانائی کے ساتھ سامنے آچکی تھی۔ حالی، شبلی، محسن الملک، اور وقار الملک، کی کوششوں کی بنا پر ایک نئے سماج اور معاشرے کی تشکیل کی کوششوں کو مقبولیت حاصل ہو رہی تھی۔ اور نئی تعلیم کی تحریک برگ و بار لا رہی تھی۔ ادب میں بھی انقلاب آچکا تھا۔ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر ادب کا سماجی اور معاشرتی رشتہ و تعلق سامنے آچکا تھا۔ ادب کے

سماجی کردار کا احساس عام ہو رہا تھا۔ ایسی تخلیقات سامنے آ رہی تھیں جو سماج اور معاشرے کی نئی روایتوں کی تشکیل و تعمیر کر رہی تھیں۔ یعنی جدید ادب و شاعری کی بوطیقا زیر تحریر تھی۔ لیکن اردو ڈراما نگاری اپنی پرانی ڈگر پر سفر طے کرتی رہی۔

یہ درست ہے کہ آغا حشر کے قبل طالب بنارسی، بیتاب دہلوی اور احسن لکھنوی نے ڈراموں میں کچھ تبدیلیاں کی تھیں لیکن یہ تبدیلیاں بھی عوامی پسند اور ناپسند کو ملحوظ رکھ کر کی گئی تھیں۔ آغا حشر بھی اپنے ابتدائی دور میں اپنے پیش روؤں کی روایت سے گہرے طور پر متاثر رہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ دوران کی مشق و ممارست کا دور تھا۔ وہ ناٹک اور اسٹیج کی دنیا میں نووارد تھے۔ مگر جلد ہی ان کی ریاضت اور مشق و ممارست نے انہیں منفرد تخلیقی شعور کا حامل بنادیا۔ چنانچہ انہوں نے بنی بنائی ڈگر سے انحراف کیا۔

آغا حشر پہلے ڈراما نگار ہیں جنہوں نے سب سے پہلے عصری زندگی کی حقیقتوں کو موضوع فن کی حیثیت دی اپنے ڈراموں میں سماجی اور معاشرتی مسائل کو جگہ دی۔ جدید اردو ادب و شاعری میں جو اولیت حسین آزادی، حالی اور شبلی کو ہے وہی اولیت اردو ڈرامہ نگاری میں آغا حشر کو ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اردو میں جدید ڈراما نگاری آغا حشر سے شروع ہوئی۔

آغا حشر کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے مقفیٰ اور مسجع اسلوب اور عبارت آرائی کی جگہ عوامی گفتگو اور لب ولہجہ کو عام کرنے کی روایت قائم کی۔ ڈرامے کی زبان کو اردو نثر کی ارتقائی تحریک و تاریخ سے ہم آہنگ کرکے اردو ڈراما نگاری کے اسلوب میں ایک انقلاب پیدا کیا۔ غزلوں اور گیتوں کے حد سے زیادہ استعمال میں اعتدال و توازن پیدا کیا۔ اردو ڈرامے کی زبان کو عصری نثری اسلوب سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ آغا حشر کا یہ اقدام اپنے سے قبل ڈراما نگاری کی روایت سے بغاوت کے مترادف تھا۔

آغا حشر کے ڈراموں میں اسیر حرص، شہید ناز، مار آستین، صید ہوس، خواب ہستی، خوبصورت بلا، یہودی کی لڑکی، رستم و سہراب، اور سلور کنگ وغیرہ سے ان کے منفرد اسلوب اور نثری روایت کا بخوبی اندازہ ممکن ہے۔ خاص طور پر 'سلور کنگ' اور 'رستم و سہراب' میں آغا حشر کی مذکورہ بالا خصوصیتیں زیادہ روشن ہیں۔ ان ڈراموں میں عصری زندگی کے آثار و کوائف کی بھرپور آئینہ داری ہوئی ہے۔ زبان و اسلوب میں بھی جدت و ندرت موجود ہے۔

آغا حشر اردو ڈرامہ نگاری کی تاریخ میں صف اول کے فنکار ہیں۔ ان کے بعد اسٹیج ڈراموں کا فن تقریباً

پس پشت پڑ گیا اور ادبی ڈراموں کا آغاز ہوا۔ پھر فلم کی ایجاد و مقبولیت نے اردو ڈرامہ نگاری کی روایت پر بے حد منفی اثرات ڈالے لیکن عصر حاضر میں بعض اہم ڈراما نگار سامنے آئے ہیں۔

اسٹیج ڈراما نگاری کی روایت کو مقبول عام بنانے اور استحکام بخشنے والوں میں آغا حشر صف اول کے فنکار ہیں۔ اردو ڈراما کو موضوع، فن اور اسلوب کی سطح پر انہوں نے ترفع سے ہم کنار کیا اور عصری زندگی اور معاشرتی تقاضوں اور عوامی شعور کی بیداری اور آزادی و انقلاب کی تحریک کو فعال اور دو آتشہ بنانے میں لازوال حصہ لیا۔ وہ اردو ڈرامے کے شیکسپیئر ہیں کہ نہیں اسے قطع نظر پریم چند اور اقبال سے کسی بھی طرح ان کا تخلیقی مرتبہ کم نہیں ہے۔

لفظ و معنی

اظہار خیال	۔	اپنے خیالات اور نظریات کو واضح کرنا
واضح	۔	کھلا، صاف
اردو کا شیکسپیئر	۔	شیکسپیئر انگریزی ادب کا ماہر ڈرامہ نگار تھا اس کی نسبت سے
عامیانہ	۔	سطحی، بہت اعلیٰ نہیں، معمولی
مقبول	۔	ہر دل عزیز، سب کا پسندیدہ
عکاس	۔	تصویر بنانا، آئینہ دکھانا، سچ سچ بیان کر دینا
روایت	۔	تاریخ، پچھلے واقعات اور حقائق کی روشنی میں کسی کو جانچنا
جرأت	۔	ہمت، کوشش
منفی اثرات	۔	وہ اثرات جس کے اثرات صحیح رجحان نہیں رکھتے، غلط مقصد
قوم پرستی	۔	اپنی قوم کی خدمات کا خیال رکھنا، قوم کا بھلا چاہنے والا

آپ نے پڑھا

- لطف الرحمٰن نے اپنے اس تنقیدی مضمون 'اردو ڈراما نگاری اور آغا حشر' پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس بات کی طرف واضح اشارے کیے ہیں کہ اب تک ان کو اردو کا شیکسپیئر اور دوسری طرف عامیانہ اور سطحی مذاق کا تخلیق کار

سمجھا جاتا رہا۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر بہر حال ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ ڈراما لکھنے والوں اور انہیں منظر عام میں مقبول بنانے کی تمام کوششوں میں ایک طرف انہوں نے اتنی عجلت دکھائی کہ وہ ایک خاص سطح کے فنکار بن کر رہ گئے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ سنیما ہو یا ڈراما اور افسانہ وہ زمانے کا عکاس ہوتا ہے جس میں وہ لکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں زمانی اور مکانی حدود سے آگے کے بھی بہت سارے نکات چھپے ہوتے ہیں۔

- آغا حشر کے سامنے سنسکرت ڈراما کی طویل روایت رہی ہے۔ مگر اس سے لوگوں نے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ ان کے یہاں واحد مقصد تفنن طبع اور ذوق ادب کی تسکین ہی تھا۔ اسی وجہ سے اس میں فارمولا فلموں کی طرح دلچسپی کے عناصر پر خاص توجہ دی جاتی رہی۔

مختصر ترین سوالات

1. لطف الرحمٰن کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟
2. لطف الرحمٰن کس پارٹی کے وزیر اور ایم ایل اے رہے؟
3. لطف الرحمٰن کی کسی دو کتاب کا نام لکھیے۔
4. آغا حشر کے کسی ایک ڈراما کا نام لکھیے۔
5. ڈراما کی تکمیل کا لازمی عنصر کیا ہے؟

مختصر سوالات

1. لطف الرحمٰن کی زندگی کے بارے میں پانچ جملے لکھیے۔
2. مضمون نگاری کی مختصر تعریف لکھیے۔
3. تنقید کے بارے میں پانچ جملے لکھیے۔
4. ڈراما کی مختصر تعریف لکھیے۔
5. آغا حشر کشمیری کی ڈراما نگاری پر پانچ جملے لکھیے۔

طویل سوالات

1. لطف الرحمٰن کی تنقید نگاری پر ایک مضمون لکھیے۔
2. آغا حشر کشمیری کی ڈراما نگاری پر روشنی ڈالیے۔

3. اردو میں تنقید کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالیے۔

4. اسم کی تعریف کیجیے اور اس کے اقسام بیان کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے اردو کے معیاری ڈراموں کی ایک فہرست بنایئے۔

2. تنقید کے موضوع پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک مذاکرہ کیجیے۔

آریہ بھٹ اور تریگنا

آریہ بھٹ : ہندوستان کے عہد قدیم کی تاریخ میں گپت دور کو سنہرا دور کہتے ہیں۔ اس دور کے حکمراں علم دوست اور انصاف پسند تھے۔ اس دور میں بڑے بڑے سائنس داں بھی تھے۔ آریہ بھٹ جیسے عظیم سائنس داں کا تعلق اسی دور سے تھا۔ وہ اپنے وقت کا عظیم ماہر علم نجوم، علم ریاضی اور علم الجبر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مشہور ماہر علم ریاضی پائیتھا گورس کی رہنمائی آریہ بھٹ نے ہی کی تھی۔

آریہ بھٹ کی جائے پیدائش کے بارے میں حتمی طور پر تو کچھ کہنا مشکل ہے لیکن قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ پٹنہ کے مغرب میں کھگول میں اس کی پیدائش ہوئی تھی۔ کھگول کے معنی علم نجوم سے ہوتا ہے اور آریہ بھٹ کا تعلق علم نجوم سے تھا۔ اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ کھگول ہی آریہ بھٹ کی جائے پیدائش ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش 476ء ہے اور 564ء میں 88 سال کی عمر میں اس کی وفات ہوگئی۔

آریہ بھٹ کے خدمات : وہ گپت عہد حکومت کا نہ صرف یہ کہ ماہر علم ریاضی تھا بلکہ علم نجوم کے میدان میں بھی ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ موجودہ دور کے سائنس داں آج بھی حیرت زدہ ہیں کہ ڈیڑھ ہزار سال قبل کے ایک سائنس داں نے علم نجوم کے ایسے اصول وضع کیے جو آج بھی سائنس دانوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ سائنس کے محققین لکھتے ہیں کہ آریہ بھٹ نے پٹنہ شہر سے تیس کیلومیٹر جنوب میں مسوڑھی کے نزدیک تریگنا میں اپنے تحقیقی کاموں کے لئے ایک تجربہ گاہ قائم کیا تھا۔ اور تریگنا میں ہی بیٹھ کر آریہ بھٹ نے اپنے مشہور تصنیف 'آریہ سدھانت اور تنتر' کو لکھا تھا۔ وہ دنیا کا پہلا سائنس داں تھا جس نے اپنی تحقیقات سے ثابت کیا کہ زمین گول ہے اور اپنے محور پر گھومتے ہوئے سورج کی گردش کرتی ہے۔ چنانچہ اس سائنس داں نے سب سے پہلے سورج گرہن اور چاند گرہن کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرائیں۔

آج علم ریاضی میں عالمی سطح پر نظام اعشاریہ (Dismal System) کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا

جاسکتا۔ بلکہ سائنس کے تمام شعبوں میں نظام اعشاریہ کی اہمیت مسلم ہے۔ سائنسی تحقیق کا یہ عظیم کارنامہ آریہ بھٹ جیسے سائنس داں نے انجام دیا۔

کہا جاتا ہے کہ علم ریاضی میں صفر کا تصور آریہ بھٹ نے ہی پیش کیا تھا۔ علم نجوم کے تعلق سے بھی آریہ بھٹ کی کئی اہم تحقیقات ہیں۔ چنانچہ موجودہ دور کے سائنس داں بھی سورج گرہن 2009ء کو دیکھنے کے لئے صحیح جگہ کی تلاش وجستجو آریہ بھٹ کی کتابوں کے مطالعہ سے ہی کیا۔ چنانچہ آریہ بھٹ کی کتاب میں اس نظام شمسی کے سیاروں کی گردش، دوری اور مختلف تاروں کے حرکات وسکنات پر عجیب وغریب معلومات موجود ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ آریہ بھٹ کی سائنسی تحقیقات پر ازسرنو تحقیق کی جائے تاکہ اس کے اہم سائنسی ایجادات سے آج کی دنیا روشناس ہوسکے۔ اسی عظیم سائنس داں نے سورج کے تعلق سے یہ مسلمہ اصول پیش کیا کہ ہماری زمین سورج کا طواف کرتی ہے اور سورج اپنے آپ میں ساکت ہے۔

سورج گرہن : کسی سیارہ یا ستارہ پر جزوی یا مکمل طور پر پردہ پڑ جانے کو گرہن کہتے ہیں۔ ہم زمین کے باشندوں کو دو طرح کے گرہن سے واسطہ پڑتا ہے۔ سورج گرہن (Solar Eclipse) اور چاند گرہن (Luner Eclipse)۔ یہ گرہن اس وقت واقع ہوتے ہیں جب ایک سیارہ یا ستارہ کسی دوسرے سیارے یا ستارے پر اپنا سایہ ڈالتا ہے۔

چونکہ چاند زمین کا طواف کرتا ہے اور زمین سورج کا طواف کرتی ہے اسی لئے چاند اور زمین کے اس طواف کے دوران چاند کا زمین اور سورج کے درمیان آجانا لازمی امر ہے۔ ایسی صورت میں چاند کا جزوی یا مکمل سایہ سورج پر پڑتا ہے اور سورج کی روشنی زمین پر آنے میں مزاحمت پیدا کرتی ہے جس کے نتیجے میں سورج گرہن ہوتا ہے۔ جزوی سورج گرہن اور مکمل سورج گرہن اس بات پر منحصر کرتا ہے کہ چاند اپنا سایہ سورج پر کس طرح اور کس زاویئے سے ڈالتا ہے یعنی جزوی سایہ ڈالنے پر جزوی سورج گرہن ہوتا ہے اور کلی سایہ ڈالنے پر مکمل سورج گرہن ہوتا ہے۔ لیکن اتنی بات طے ہے کہ مکمل سورج گرہن سو سال کی طویل مدت کے بعد ہی ہوتا ہے۔ سورج گرہن ایک جغرافیائی واقعہ ہے جو تاریخ کے ابتدائی دور سے ہی ہوتا آرہا ہے اور انسان اسے ننگی آنکھوں سے دیکھتے آئے ہیں۔ لیکن آج بھی سورج گرہن کا واقعہ انسانوں کے لئے تجسس کا موضوع بنا ہوا ہے۔

ترِگنا کی جغرافیائی اہمیت : تریگنا پٹنہ سے دکھن جانب ۳۰ کیلومیٹر کی دوری پر مسوڑھی سب ڈویژن میں واقع ہے۔ اور اسی مناسبت سے پٹنہ گیا ریلوے لائن میں مسوڑھی اسٹیشن کا نام تریگنا رکھا گیا ہے۔ مسوڑھی اسٹیشن سے محلہ رحمت گنج تک بشمول سب ڈویژن کے تمام سرکاری دفاتر تریگنا کے ہی حلقہ میں آتے ہیں یعنی تریگنا کا علاقہ پچھم میں سون ندی اور پورب میں پن پن ندی تک پھیلا ہوا ہے۔ تریگنا کے محل وقوع کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہاں سالوں بھر آسمان میں فضا صاف رہتی ہے۔ یہاں سے تاروں، سیاروں اور مکمل نظام شمسی کی تحقیق کرنا نسبتاً آسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آریہ بھٹ نے اپنے جغرافیائی تحقیق کے لئے اس مقام کو منتخب کیا اور وہاں اپنے تحقیق کے لئے ایک تجربہ گاہ بنایا۔ تریگنا ہندی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی 'تارے گننا' کے ہوتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اس مقام کا نام تریگنا رکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ آریہ بھٹ نے ساٹھ فٹ کی بلندی کا ایک ٹیلہ بنایا جس پر بیٹھ کر وہ رات کو تاروں اور سیاروں کے بارے میں تحقیقی کام کیا کرتا تھا۔ نظام شمسی کی رفتار، سورج گرہن اور چاند گرہن کے بارے میں تفصیلی معلومات آریہ بھٹ نے تریگنا میں ہی حاصل کئے۔ اپنی تحقیقات کے نتائج کو اس نے اپنی ایک کتاب میں تحریر کئے جو آج کے سائنس دانوں کے لئے رہنمائی کا کام کرتی ہے۔

2009ء کا سورج گرہن اور تریگنا: اکیسویں صدی کا سب سے بڑا سورج گرہن 22 رجولائی 2009ء کو پیش آیا۔ اس سورج گرہن کی اہمیت اس لئے بڑھ گئی کہ ایسا سورج گرہن ایک صدی کے بعد ہی واقع ہوتا ہے۔ امریکہ کے سائنسی تحقیقی ادارہ ناسا (NASA) کے ایک سائنس داں جے اینڈرسن جو گزشتہ بیس سالوں سے 2009ء میں پیش آنے والے اس سورج گرہن پر تحقیقی کام کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے 2008ء میں 200 صفحات پر مشتمل ایک تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں انہوں نے واضح کیا کہ اس سورج گرہن کے مشاہدہ کے لئے مناسب ترین مقام تریگنا ہے۔ پھر کیا تھا تریگنا کو عالمی سطح پر شہرت حاصل ہوگئی۔ اس کی وجہ سے 1500 سو سال قبل کے تریگنا میں آریہ بھٹ کے تجربہ گاہ کی تاریخ زندہ ہوگئی۔

جولائی 2009ء کے پورے مہینہ میں ملکی اور غیر ملکی اخبارات اور ذرائع ابلاغ میں تریگنا کو نمایاں مقام حاصل ہوگیا۔ 22 رجولائی کی تاریخ قریب آتی گئی اور تریگنا سے متعلق ساری دنیا کا تجسس بڑھتا چلا گیا۔ ناسا رپورٹ میں جے اینڈرسن (J. Anderson) نے تریگنا کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہاں بادل

چھانے کا اوسط امکان بہت کم ہے اور دھوپ کی تمازت بھی دوسرے شہروں کے مقابلہ میں 43 فیصد زیادہ ہے۔ اس صورت میں سورج گرہن کے نظارے اور مشاہدہ کے لئے تریگنا مناسب ترین مقام ہے۔

22 رجولائی 2009ء کے اس سورج گرہن کا مشاہدہ کرنے کے لئے ملک اور بیرون ملک کے سائنس داں بہار کی راجدھانی پٹنہ پہنچنے لگے۔ یہاں تک کہ امریکہ کے ناسا اور اسرو جیسے سائنسی تحقیقی اداروں کے سائنس دانوں کی ٹیم بھی وہاں پہنچ گئی۔ پولینڈ کے سائنس دانوں کی ایک ٹیم بھی گئی۔ دہلی اور نینی تال تک کے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سائنس دانوں کی جماعت 21 رجولائی کو تریگنا پہنچ گئی۔ حکومت بہار نے اپنے تمام اعلیٰ افسروں کو نظم و نسق سنبھالنے کے لئے تریگنا بھیج دیا۔ تریگنا اسپتال کی نئی عمارت کو سائنس دانوں کے مشاہدے کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ چھت کے اوپر مختلف قسم کے آلات نصب کئے گئے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں عام لوگ رات میں ہی پٹنہ سے تریگنا آچکے تھے۔ 22 رجولائی کو سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی انتظار کی گھڑی ختم ہونے والی تھی جب سارا سورج چاند کے لپیٹ میں آنے والا تھا اور سورج کے اوپری کنارے کا وہ حصہ جو ہیرے کی انگوٹھی کی شکل میں ہوگا، روشن دکھائی دینے والا تھا۔ ہزاروں لوگوں کی آنکھوں پر سورج گرہن دیکھنے کے لئے ایک خاص قسم کے چشمے لگے ہوئے تھے۔ لوگوں کا تجسس رفتہ رفتہ بڑھتا جارہا تھا لیکن افسوس کہ تریگنا کا آسمان اچانک ابر آلود ہوگیا بارش کے قطرات بھی گرنے لگے۔ صبح 5 بج کر 29 منٹ اور 58 سکنڈ کا وہ لمحہ آہی گیا جس کا ساری دنیا کو شدت سے انتظار تھا۔ لیکن انسان کی ساری تیاریوں نے نظامِ قدرت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے اس کے باوجود لوگوں نے ایک عجیب و غریب ماحول کا نظارہ کیا۔ ایسا لگا کہ رات واپس ہوگئی اور ہر طرف گھنا اندھیرا چھا گیا۔ ان لمحات میں جانور سہمے ہوئے نظر آئے۔ پرندے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹتے نظر آئے اور مشرق کی جانب آسمان میں تارے بھی نظر آئے اور درجہ حرارت میں کمی کا احساس بھی ہوا۔

ہیرے کا چھلہ دیکھنے کی تمنا لئے ملک اور بیرون ملک کے سائنس داں واپس ہونے لگے اور اب اس چھلہ کو دیکھنے کے لئے دنیا کو 123 سالوں تک انتظار کرنا پڑے گا۔ دن میں مکمل تاریکی اور ایک عجیب و غریب خاموش منظر اور ہزاروں ہزار افراد کا ہجوم تریگنا کے لئے اب ایک ناقابلِ فراموش تاریخی واقعہ بن گیا ہے۔

ماخوذ

لفظ و معنی

عہد	۔	زمانہ
قدیم	۔	بہت پرانا
علم دوست	۔	علم سے دلچسپی رکھنے والے
انصاف پسند	۔	انصاف کرنے والے
سائنس داں	۔	علم سائنس کا ماہر
علم ریاضی	۔	علم الحساب
پائتھا گورس	۔	ایک مشہور سائنس داں کا نام
علم نجوم	۔	ستاروں سے متعلق علم
آریہ بھٹ	۔	ہندوستان کے ایک مشہور سائنس داں کا نام
وضع کرنا	۔	ایجاد کرنا
محقق	۔	تحقیق کرنے والے
تجربہ گاہ	۔	سائنسی تجربوں کا مرکز
محور	۔	دھوری
گردش کرنا	۔	گھومنا
افادیت	۔	فائدہ، فائدے کا اندازہ
شعبہ	۔	گوشہ۔ تعلیم کا محدود حلقہ
جستجو	۔	تلاش
نظامِ شمسی	۔	سورج اور اس کے اردگرد گردش کرنے والے سیاروں کا مجموعہ
جزو	۔	تھوڑا، ٹکڑا
امر	۔	معاملہ
طواف	۔	کسی چیز کے چاروں طرف گھومنا
از سرِ نو	۔	نئے سرے سے

آپ نے پڑھا

- ہندوستان کی قدیم تاریخ میں گپت دور کو ہندوستان کا سنہرا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور کے حکمراں نہ صرف یہ کہ علم دوست اور انصاف پسند تھے بلکہ عالموں اور سائنس دانوں کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔
- آریہ بھٹ جیسے عظیم سائنس داں کا تعلق گپت دور سے تھا اور صوبہ بہار کو اس عظیم سائنس داں کی جائے پیدائش ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آریہ بھٹ ایک عظیم سائنس داں ہونے کے علاوہ ماہر نجوم، علم ریاضی اور علم الجبر تھا۔ مشہور ماہر علم ریاضی پائتھا گورس کی رہنمائی آریہ بھٹ نے ہی کی تھی۔
- آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل آریہ بھٹ نے علم نجوم کے ایسے اصول وضع کئے تھے کہ جن کو دیکھ کر آج کے سائنس داں حیرت زدہ ہیں۔ یہ اصول آج بھی سائنس دانوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔
- آریہ بھٹ نے پٹنہ سے بیس کیلومیٹر جنوب میں مسوڑھی کے پاس تریگنا میں اپنے تحقیقی کاموں کے لئے ایک تجربہ گاہ قائم کیا تھا۔ اور وہیں بیٹھ کر اس نے سائنس کے موضوع پر 'آریہ سدھانت اور تنتر' نام کی ایک کتاب لکھی اور پہلی بار یہ ثابت کیا کہ زمین گول ہے اور یہ اپنے محور پر گھومتے ہوئے سورج کی گردش کرتی ہے۔
- سورج گرہن اور چاند گرہن کے بارے میں آریہ بھٹ نے تفصیلی معلومات فراہم کرائیں۔ کسی سیارہ یا ستارہ پر جزوی یا مکمل طور پر پردہ پڑ جانے کو گرہن کہتے ہیں۔ ہم زمین کے باشندے کو دو طرح کے گرہن سے واسطہ پڑتا ہے۔ سورج گرہن (Solar Eclipse) اور چاند گرہن (Luner Eclipse)۔ یہ گرہن اس وقت واقع ہوتے ہیں جب ایک سیارہ یا ستارہ کسی دوسرے سیارے اور ستارے پر اپنا سایہ ڈالتا ہے۔

معروضی سوالات

1. آریہ بھٹ کی پیدائش کہاں ہوئی۔

(الف) بہار (ب) جھارکھنڈ (ج) اڑیسہ (د) آسام

2. آریہ بھٹ نے اپنا تجربہ گاہ کہاں قائم کیا؟

(الف) گیا (ب) تریگنا (ج) پٹنہ (د) کھگول

3. ہندوستان میں گپت عہد کو کیسا دور کہا جاتا ہے؟

(الف) جمہوری دور (ب) ترقی پسند دور (ج) سنہرا دور (د) تاریک دور

4. آریہ بھٹ کا تعلق کس عہد سے تھا؟

(الف) گپت عہد (ب) مغلیہ عہد (ج) موریہ عہد (د) برٹش عہد

5. آریہ بھٹ نے کس سائنس داں کی رہنمائی کی تھی؟

(الف) گلیلیو (ب) پائتھو گورس (ج) ٹامس ایڈیشن (د) ابوالکلام

مختصر سوالات

1. سورج گرہن اور چاند گرہن کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔
2. آریہ بھٹ کی جائے پیدائش اور تاریخ پیدائش پر روشنی ڈالیے۔
3. تریگنا کے محل وقوع پر پانچ جملے لکھیے۔
4. کیا سورج گرہن کو ننگی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟
5. 2009ء کے سورج گرہن کی اہمیت بیان کیجیے۔

طویل سوالات

1. سورج گرہن اور چاند گرہن کے اسباب پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
2. آریہ بھٹ کے سائنسی کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. سورج، چاند اور زمین کی تصویر بنا کر گرہن کو دکھائیں۔
2. کلاس گلوب کی مدد سے زمین کی گردش کو معلوم کریں۔
3. آریہ بھٹ کے سائنسی ایجادات اور کارناموں کا ایک چارٹ بنائیں۔
4. سورج گرہن اور چاند گرہن کے موضوع پر کلاس میں ایک مذاکرہ کریں۔

ناول

اردو کی نثری ادب میں ناول ایک اہم شاخ ہے۔ ناول کے فن کے ذریعہ ہماری زندگی، ماحول اور روزمرہ کے معاملات کی آئینہ داری ہوتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ صنف مغربی ادب کی دین ہے۔ برطانیہ کی ایک خاتون ادیبہ کلارا دیوز نے ناول کی تعریف اس طرح کی ہے: 'ناول اس زمانے کی زندگی اور معاشرت کی سچی تصویر ہے جس زمانے میں وہ لکھا جائے۔' گویا ناول نگاری کا مقصد حقیقی زندگی اور اس کے ماحول کی ترجمانی سچے طور پر کرنا ہے۔

فنی اعتبار سے پلاٹ، کردار، ماحول، مکالمہ، جذبات نگاری، فلسفۂ حیات، زبان وغیرہ ناول کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

مغربی ممالک میں صنعتی انقلاب کے بعد ناول نگاری کی ابتدائی کوششیں شروع ہوگئی تھیں اور کچھ ہی مدت میں ناول نگاروں کی ایک جماعت تیار ہوگئی جن کی کوششوں سے صنف ناول کو اعتبار حاصل ہوگیا۔

اردو ناول کو فروغ دینے والوں میں ڈپٹی نذیر احمد کا نام سرِفہرست ہے۔ انہوں نے 'مراۃ العروس' کے عنوان سے قصے کی ایک ایسی کتاب لکھی جسے بعد کے زمانے میں اردو کا پہلا ناول قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ نذیر احمد نے چھ ناول لکھے ان تمام ناول کے قصوں کا مقصد قوم کی زبوں حالی اور اصلاح معاشرہ ہے۔ شاد عظیم آبادی کا ناول 'صورۃ الخیال'، حالی کے 'مجالس النساء'، 'رشیدۃ النساء' اور 'اصلاح النساء' وغیرہ میں بھی کم و بیش نذیر احمد کی تقلید ہے۔ اسی زمانے میں عبدالحلیم شرر اور پنڈت رتن ناتھ سرشار نے ناول نگاری کا ایک الگ نگار خانہ سجایا۔ شرر تاریخ کے پردے میں اپنی باتیں کہتے ہیں جبکہ سرشار تہذیب و ثقافت اور قدروں کو اپنے ناول کی بنیاد بناتے ہیں۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں اردو ناول کے نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ مرزا ہادی رسوا 'امراؤ جان' لے کر منظر عام پر آئے۔ ناول کے فن اور تکنیک کے اعتبار سے مرزا ہادی رسوا نے جس عہد جدید کا خاکہ کھینچا اس کا عروج پریم چند کے ناولوں میں نظر آتا ہے۔ 'گئودان' سے 'میدان عمل' تک پریم چند کے پندرہ ناول اس کے عمدہ نمونے ہیں۔

پریم چند کے بعد ترقی پسند ناول نگاروں میں سجاد ظہیر کا ناول 'لندن کی ایک رات' ہے۔ کرشن چندر اور عصمت چغتائی ترقی پسندوں میں خاصے مقبول ناول نگار ہیں۔ ناول کا سفر مسلسل جاری ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد

نذیر احمد کی پیدائش 6 دسمبر 1836ء کو ضلع بجنور کے افضل گڑھ پرگنہ کی بستی کوریٹر میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سعادت علی تھا۔ نذیر احمد کا نسبی سلسلہ ایک بزرگ عبد الغفور اعظم پوری سے ملتا ہے جو شاہ عبدالقدوس گنگوہی کے مشہور خلفاء میں تھے۔ ان کے نانا قاضی غلام علی شاہ کا شمار بھی اپنے وقت کے بڑے بزرگوں میں ہوتا تھا۔

نذیر احمد کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں ہوئی۔ اپنے والد سعادت علی سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی اور مولوی نصر اللہ سے بھی عربی کی معیاری کتابوں کی تعلیم حاصل کی۔ پھر نذیر احمد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے دہلی گئے۔ پرنسپل کارگل کے توسط سے 1845ء میں دہلی کالج میں داخل ہوئے اور 1853ء تک دہلی میں مقیم رہے۔ اسی دوران مولوی عبد الخالق کی پوتی سے ان کی شادی ہوگئی۔ 13 سال کی عمر میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ شادی کے بعد فکر معاش دامن گیر ہوئی وہ حصول معاش کے لئے پنجاب گئے اور ٹیمپل صاحب میں چالیس روپیہ ماہوار پر معلمی کے فرائض انجام دینے لگے۔ اس ملازمت سے وہ مطمئن نہیں تھے اس لئے استعفیٰ دے دیا اور کانپور میں مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر ہوگئے۔ لیکن ناموافق حالات کے نتیجہ میں یہاں بھی استعفیٰ دینا پڑا۔ اسی دوران غدر 1857ء کا واقعہ پیش آیا۔ کسی طرح دہلی آگئے اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے۔

ڈپٹی نذیر احمد کو اردو کا اولین ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ مراۃ العروس کی اشاعت 1869ء میں ہوئی۔ اس ناول کے دو کردار اکبری اور اصغری اب بھی زندہ کردار ہیں۔ اس کے بعد 1872ء میں ان کا ناول 'بنات النعش' شائع ہوا۔ اس ناول میں تعلیم پر خاصا زور دیا گیا ہے۔ اس کا ایک کردار اصغری خانم تعلیم نسواں کو عام کرتی ہیں۔ توبۃ النصوح کی اشاعت 1877ء میں ہوئی۔ فنی اعتبار سے توبۃ النصوح قدرے بہتر ہے۔ نصوح عالم خواب میں حشر کا نقشہ دیکھتا ہے۔ یہی خواب اس کی زندگی میں اصلاحی انقلاب کا باعث ہوتا ہے۔ فسانہ مبتلا 1885ء میں شائع ہوا۔ ابن الوقت نذیر احمد کے ناولوں میں سب سے اہم ہے۔ نذیر احمد کا آخری ناول رویائے صادقہ ہے جو 1884ء میں شائع ہوا۔ نذیر احمد کے ناولوں کے دور رس اثرات مرتب ہوئے اس حد تک کہ ہر علاقے میں اس نوعیت کی اصلاحی تحریریں مسلسل لکھی جانے لگیں۔ اپنی تصانیف کے ذریعہ نذیر احمد نے اردو ناول کے لئے ایک میدان تیار کردیا۔ 74 سال کی عمر میں نذیر احمد پر فالج کا اثر ہوا۔ اور 28 دسمبر 1910ء میں ان کا وصال ہوگیا۔

فہمیدہ اور منجھلی بیٹی حمیدہ کی گفتگو

فہمیدہ: تم کو جواب چند روز سے نماز پڑھتے دیکھتی ہوں تو پرسوں مجھ سے پوچھنے لگی کہ اما جان دن میں کئی مرتبہ ابا جان ہاتھ منھ دھو کر یہ کیا کیا کرتے ہیں۔ پہلے دیر تک بڑے ادب سے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ چپکے چپکے کچھ باتیں کرتے ہیں پھر جھکتے ہیں پھر منھ کے بل گر پڑتے ہیں۔

میں: بیٹی نماز پڑھتے ہیں۔

حمیدہ: اما جان نماز کیا۔ نماز کو اس استعجاب کے ساتھ پوچھنا یہ پہلی چٹکی تھی کہ اس نے میرے دل میں لی۔

میں: بیٹی خدا کی عبادت کو نماز کہتے ہیں۔

حمیدہ: اما جان خدا کیا چیز ہے اور عبادت اس کی کون ہے۔ اس کا بھولے پن سے یہ پوچھنا تھا کہ خدا کیا چیز ہے اور عبادت اس کی کون ہے کہ میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

میں: کیوں کیا تم خدا کو نہیں جانتیں۔

حمیدہ: میں سب لوگوں کو خدا کی قسم کھاتے تو سنتی ہوں اور جب کبھی اما جان تم خفا ہوتی ہو تو کہا کرتی ہو خدا کی مار اور تجھے خدا سمجھے شاید خدا بیجا کو کہتے ہیں مگر بیجا ہوتی تو اس کی قسم نہ کھاتے۔

میں: حمیدہ توبہ کرو توبہ خدا بیجا نہیں ہے خدا وہ ہے جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے وہی روزی دیتا ہے وہی مارتا ہے وہی جلاتا ہے وہی پالتا ہے۔ حمیدہ۔ کیا ابا جان تم کو بھی خدا ہی نے پیدا کیا ہے۔

میں: ہاں مجھ کو بھی۔

حمیدہ: اور ابا جان کو بھی۔

میں: ہاں تمہارے ابا جان کو بھی۔

حمیدہ: اور نئی بوا کو بھی۔

میں: ہاں ننی بوا کو بھی۔

حمیدہ: اما جان کیا ہر روز ہمارے گھر میں کھانا نہیں پکتا۔

میں: کیوں نہیں پکتا۔

حمیدہ: پھر تم تو کہتی ہو کہ خدا سب کو کھانے کو دیتا ہے۔

میں: اللہ میاں پانی برساتے ہیں۔ اللہ میاں غلے اور میوہ اور ترکاریاں ہم لوگوں کے واسطے زمین میں اگاتے ہیں وہی ہم سب لوگ کھاتے ہیں۔

حمیدہ: ننی بوا کو تو اما جان تم دودھ پلاتی ہو۔

میں: دودھ بھی اللہ میاں ہی اتارتے ہیں۔ تمہاری ہی دفعہ اسی دودھ کے پیچھے برسوں مصیبت اٹھائی۔ چھٹی تک الغاروں دودھ تھا چھٹی نہا کر اٹھی کہ یکایک جاڑا چڑھا بخار آیا تو کس شدت کا کہ الامان تمام بدن سے آنچ نکلتی تھی۔ وہ پہر بھر کا بخار آنا اور دودھ کا تاؤ کھا جانا پھر بہتری ستاول پھانکی زیرہ پیا حکیم کا علاج کیا تمہارے دادا جان خدا جنت نصیب کرے ہر روز صبح کو تشتری لکھ دیا کرتے تھے مگر دودھ کچھ ایسی گھڑی کا سوکھا تھا کہ پھر نہ اترا پر نہ اترا جب دیکھا کہ بچی بھوک کے مارے پھڑکی چلی جاتی ہے ناچار انا رکھی اور وہ عذاب اٹھائے کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ خدا نے زندگی بخشی تھی کہ تم پل گئیں۔

حمیدہ: تو اللہ میاں بڑے اچھے ہیں ہم سب کو کھانے کو دیتے ہیں ہماری ننی بوا کے واسطے دودھ اتارتے ہیں۔ لیکن اما جان اللہ میاں سے ہمارا کچھ رشتہ ناتا ہے کہ اتنے سلوک کرتے ہیں۔

میں: رشتہ ناتا یہ کہ ہم ان کے بندے ہیں۔ مرد ان کے غلام ہیں۔ عورتیں ان کی لونڈیاں ہیں۔

حمیدہ: لونڈی غلاموں کے ساتھ اتنا سلوک کہ کوئی اپنے بچوں کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔ لیکن لونڈی غلام تو اپنے مالک کی خدمت کرتے ہیں ٹہل کرتے ہیں۔ ہم اللہ میاں کا کون سا کام کرتے ہیں۔

میں: یہی نماز جو تم نے اپنے باپ کو پڑھتے دیکھی اور جس کو عبادت کہتے ہیں۔

حمیدہ: ہاں نماز اللہ میاں کا کام ہے تو بچی کو نہ پڑھنی چاہئے کیونکہ لونڈی غلام سب ہیں۔ اللہ میاں کی دی ہوئی روٹی سب کھاتے ہیں۔

میں: بیشک خدا کی عبادت سب پر فرض ہے۔

حمیدہ: اماجان تم تو نماز نہیں پڑھتیں کیا تم اللہ میاں کی لونڈی نہیں ہو اور کیا تم اس کی دی ہوئی روٹی نہیں کھاتیں۔ حمیدہ نے جو سادہ دلی اور بھولے پن سے یہ الزام دی مجھ کو اس قدر شرم آئی کہ زمین پھٹ گئی ہوتی تو میں سما جاتی۔

میں: میں لونڈی بے شک ہوں اور خدا ہی کی دی ہوئی روٹی کھاتی ہوں لیکن کیا بعض لونڈیاں نکمی اور کام چور اور نمک حرام اور بے غیرت نہیں ہوتیں ویسی ہی اللہ میاں کی ایک لونڈی میں ہوں۔

حمیدہ: ابا جان بھی تو اب بیماری سے اٹھ کر نماز پڑھنے لگے ہیں۔ کیا اس سے پہلے وہ خدا کی دی ہوئی روٹی نہیں کھاتے تھے۔

یہ سن کر نصوح کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔

میں: وہ بھی برا کرتے تھے۔

حمیدہ: اچھی اماجان اللہ میاں خفا ہوتے ہوں گے۔

میں: خفا ہونے کی تو بات ہی ہے۔

حمیدہ: ایسا نہ ہو کہ روٹی بند کردیں تو ہم کہاں سے کھائیں گے اور اگر ننی بوا کا دودھ سوکھ جائے گا تو ہماری ننی روئے گی۔

یہ کہہ کر حمیدہ رونے لگی۔ میں نے اٹھا کر گلے سے لگا لیا اور پیار کیا لیکن جس قدر میں اس کو تسلی دیتی تھی وہ اور دو گنا روتی تھی۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور مجھ کو روتے دیکھ کر وہ اور بھی بیتاب ہو گئی۔ آخر بڑی بڑی مشکلوں سے میں نے اس کو سنبھالا اور کہا کہ حمیدہ تم ڈرو مت اللہ میاں کا یہ دستور نہیں ہے کہ جو لونڈی غلام کام نہ کریں ان کا کھانا بند کر دیں۔

حمیدہ: سچ میں۔

میں: ہاں ہاں تم گھبراؤ مت۔

حمیدہ: اچھی اماجان ننی کو پلا کر دیکھو دودھ ہے یا نہیں۔

میں: بیٹی ننی کو سونے دو اور دودھ سے اطمینان رکھو دودھ خدا کا دیا ہوا بہت ہے۔

حمیدہ: ہمارے گھر میں تو لونڈی غلام نہیں نوکر چاکر ہیں مگر کام نہیں کرتے تو تنخواہ کاٹ لی جاتی ہے اماجان

جرمانہ کر دیا کرتے ہیں گھر سے نکال دیتے ہیں۔ اللہ میاں اپنے لونڈی غلاموں پر بھی خفا نہیں ہوتے تو ایسے مالک کا کام تو اور بھی جی لگا کر کرنا چاہیے کیا کام نہ کرنا اور کھانا بے غیرتی نہیں ہے۔

میں: بڑی بے غیرتی کی بات ہے۔

حمیدہ: اماں جان میں نے تو آج تک نماز نہیں پڑھی اور نہ مجھ کو نماز پڑھنی آتی ہے اور تم تو دن رات میں دو ہی مرتبہ کھانا کھاتی ہو۔

میں: نہیں معلوم کتنا دفعہ کھاتی ہوں۔ مجھ پر اللہ میاں ضرور خفا ہوئے ہوں گے۔

یہ کہہ کر پھر حمیدہ روئی اور ڈر کے مارے دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی اور پھر میں نے سمجھایا کہ حمیدہ ڈرو مت اللہ میاں تم سے ناخوش نہیں ہیں۔ ابھی تم بچی ہو تم کو نماز معاف ہے۔

حمیدہ: کھانا تو مجھ کو بھی سب کے برابر بلکہ سب سے اچھا اور زیادہ ملتا ہے۔

میں: ہاں ملتا ہے اور یہ بھی خدا کی مہربانی ہے کہ تم کو کام معاف کر رکھا ہے۔

حمیدہ: پھر اللہ میاں مجھ کو کیوں کھانا دیتے ہیں۔

میں: اس واسطے کہ جب بڑی ہو جاؤ تو اس کے بدلے کا بہت سا کام کرو۔

حمیدہ: لیکن کیا میں اب کام نہیں کر سکتی۔ دیکھو میں تم کو پان بنا دیتی ہوں۔ ابا جان کو پانی پلا دیتی ہوں۔ ننی بوا کو بہلا لیتی ہوں۔ کیوں اماں جان کرتی ہوں۔

میں: ہاں بوا جان تم تو میرے بہت کام کرتی ہو پنکھا اجھل دیتی ہو، دھاگا بٹ دیتی ہو سوئی میں دھاگا پرو دیتی ہو جو چیز مجھ کو درکار ہوئی ہے لے آتی ہو۔

حمیدہ: تو کیا میں اللہ میاں کا کوئی چھوٹا سا کام بھی نہیں کر سکتی۔ کیا نماز پڑھنا بڑا مشکل کام ہے۔ میں تو دیکھتی ہوں ابا جان ہاتھ منھ دھو کر باندھے کھڑے رہتے ہیں کیا اتنا مجھ سے نہیں ہو سکتا۔

میں: اس کے سوائے کچھ پڑھنا بھی ہوتا ہے۔ جس کو تم کہتی تھیں کہ چپکے چپکے باتیں کرتے جاتے ہیں۔

حمیدہ: وہ کیا باتیں ہیں۔

میں: خدا کی تعریف اور اس کے احسانوں کا شکریہ، اپنے گناہوں کا اقرار اور ان کی معافی کی درخواست، اس کے رحم کی تمنا، اس کے فضل کی آرزو بس یہی نماز ہے۔

حمیدہ: یہ سب باتیں اسی طرح کرتے ہوں گے جیسے ہم لوگ آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔

میں: اور کیا۔

حمیدہ: مگر ابا جان تو کچھ اور ہی طرح کی بولی بولنے لگتے ہیں۔

میں: وہ عربی زبان ہے۔

حمیدہ: وہ تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اماجان تم جانتی ہو۔

میں: نہیں میں بھی نہیں جانتی۔

حمیدہ: تو کیا خدا سے عربی ہی زبان میں باتیں کرنی ہوتی ہیں۔

میں: نہیں وہ سب کی بولی سمجھتا ہے بلکہ وہ تو دلوں کے ارادوں اور طبیعتوں کے منصوبوں سے بھی واقف ہے۔

حمیدہ: یہ کیوں کر۔

میں: اس واسطے کہ وہ ہر وقت ہر جگہ موجود ہے۔ کوئی چیز کوئی بات اس سے مخفی نہیں۔ سب کو دیکھتا ہے سب کی سنتا ہے اگلے پچھلے کل حالات اس کو معلوم ہیں۔

حمیدہ: (گھبرا کر) کیا اللہ میاں یہاں ہمارے گھر میں بیٹھے ہیں۔

میں: گھر میں کیا ہمارے پاس بیٹھے ہیں مگر ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے۔

یہ سن کر حمیدہ نے جلدی سے اوڑھنی اوڑھ لی اور سنبھل کر مودب ہو بیٹھی اور مجھ سے بھی آہستہ سے کہا: اماجان سر ڈھک لو۔ اس کے بعد حمیدہ پر کچھ ایسی ہیبت غالب آئی کہ میری گود میں تھوڑی دیر تک چپ پڑی رہی آخر آنکھ لگی، سوگئی۔ میری ٹانگیں سُن ہونے لگیں تو میں نے آہستہ سے چارپائی پر لٹا کر بیدارا کو پاس بٹھادیا کہ دیکھے ہاتھ رکھے رہیو ایسا نہ لڑکی سوتے سوتے ڈر کر چونک پڑے اور میں یہاں چلی آئی۔ مجھ کو حمیدہ کی باتوں سے ایسا لگا کہ اندر سے کلیجہ تھر تھر کانپا جاتا تھا۔

نصوح: کیوں ڈرکی اس میں کیا بات تھی۔

فہمیدہ: میں کہتی تھی کہ ایسی چھوٹی سی لڑکی اور ایسی باتیں کچھ اس کو ہو تو نہیں گیا۔

نصوح: مذہب میں بڑی خوبی اور عمدگی تو یہی ہے کہ وہ ایسی باتوں کی تعلیم کرتا ہے جن کو ہر شخص سمجھ سکتا

ہے۔ مسائل دینی آدمیوں کے بنائے ہوئے نہیں اور لوگوں کی گڑھی ہوئی پہیلیاں نہیں ہیں کہ ان کے حل کرنے اور بوجھنے کو بڑا غور و خوض درکار ہو بلکہ اس حکیم برحق کے باندھے ہوئے اصول اور ٹھہرائے ہوئے ضابطے ہیں اور اصول بھی کیسے سلیس اور آسان۔ ضابطے سہ اور بدیہی۔ نہیں معلوم انسان کی عقل پر کیا پتھر پڑ گئے ہیں کہ اتنی موٹی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ زمین آسمان چاند سورج ستارے انواع و اقسام کے حیوانات رنگ برنگ کے نباتات ساری دنیا تمام زمانہ اتنا بڑا کارخانہ جس میں کا ایک پتا اٹھا کر دیکھو تو ہزار صنعتوں سے بھرا ہوا ہے آخر خود بخود تو نہیں ہو گیا ضرور کوئی اس کا بنانے والا ہے اور پھر اس نے جو انسان کو ایک خاص صفت عقل عطا کی ہے کچھ تو اس تخصیص کا مطلب ہے۔ مگر ہے کیا کہ انسان اس تصور کو اپنے ذہن میں آنے ہی نہیں دیتا ورنہ ساری خدائی خدا کی گواہی دے رہی ہے۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار

ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

حمیدہ نے کوئی بات اچنبھے کی نہیں کہی۔ اچنبھے کی بات تو یہ ہے کہ ہم میں نادان بچوں کے برابر بھی عقل نہیں۔ ڈوب مرنے کی جگہ ہے زمین میں گڑ جانے کا مقام ہے۔ بلکہ حمیدہ کی باتوں کو میں ایک فال نیک اپنی کامیابی کی سمجھتا ہوں افسوس ہے تم اس کو میرے پاس نہ لے آئیں۔ اس کی ہر ہر بات لوح دل پر کندہ کرنے کے لائق ہے اور یہ باتیں اس نے کیا کہیں خدا نے اس کے منھ سے کہلوائیں۔ بیٹی کیا ہے سچ پوچھو تو ہمارے لئے ہدایت کا فرشتہ ہے اور بچے جو معصوم کہلاتے ہیں اسی سبب سے کہ ان کے دل لوث دنیا سے پاک اور تیرگی گناہ سے صاف ہوتے ہیں۔ الحمد اللہ کہ ایک سے تو اطمینان ہوا اب یہ بتاؤ کہ اوروں کے واسطے کیا انتظام کرنا ہوگا۔

فہمیدہ: تم ہی کوئی تجویز سوچو۔

نصوح: میں نے تو یہ سوچا ہے کہ لڑکیوں کو تم سنبھالو اور لڑکوں کو میں سمجھ لوں گا۔

فہمیدہ: بھلا میں بھی تو سمجھوں کیوں کہ سمجھ لو گے کہ وہی تدبیر میں بھی کروں۔

نصوح: میں پہلے چھوٹوں سے شروع کروں گا امید ہے کہ جلد راہ پر آ جائیں بڑوں کا مجھ کو بڑا کھٹکا ہے یہ تو میں خوب جانتا ہوں کہ یہ نیا ڈھنگ دیکھ کر ان کے کان کھڑے ہوں گے مگر نہیں معلوم کس سے کیا معاملہ پیش آئے۔ تم اتنا کرو کہ ایک تو میرا تمہارا دونوں کا کام ایک ساتھ شروع ہو جب اندر باہر دونوں جگہ ایک ہی بات کا چرچا

ہوا تو کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ دیکھو خاص کر ہمارے پیچھے پڑے ہیں۔ اولاد اولاد سب برابر ان سے کچھ تعرض نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ تمہاری ہر ادا سے یہ بات پیدا ہو کہ اس معاملے میں ہم دونوں کو ایک اہتمام خاص ہو کیوں کہ ذرا سا ضعف بھی ظاہر ہوگا تو تمام تر انتظام درہم و برہم ہو جائے گا۔

فہمیدہ: انشاء اللہ اس کے خلاف نہ ہوگا۔

لفظ و معنی

استعجاب	-	حیرت، تعجب
عبادت	-	بندگی
رونگٹے	-	جلد کے بال
خفا	-	ناراض
بیجا	-	نامناسب
غلہ	-	اناج
شدت	-	سختی
الامان	-	پناہ تلاش کرنا (عربی اصطلاح ہے)
زمین پھٹ جائے اور سما جانا	-	بہت زیادہ شرمندہ ہونا
نکمی	-	کام چور
ضبط کرنا	-	برداشت کرنا
بیتاب ہونا	-	بے چین ہونا، بے قرار ہونا
بے غیرت	-	بے حیا، بے شرم
منصوبہ	-	پروگرام کرنے کا منظم انداز
مخفی	-	چھپا ہوا، پردے میں
مؤدب	-	ادب کے ساتھ

آنکھ لگنا	۔	اونگھنا، نیند آنا، جھپکی لینا
معمہ	۔	بجھول، پہیلی
سہل	۔	آسان
ضابطہ	۔	اصول، قاعدہ
بدیہی	۔	سامنے
انواع	۔	قسم (نوع کی جمع)
نباتات	۔	پیڑ پودے (نبات کی جمع)
خود بخود	۔	اپنے آپ سے
تخصیص	۔	خاص کرنا، مخصوص کرنا
برگ	۔	پتی، پتہ
لوح	۔	تختی
لوث	۔	غرض، مقصد
تیرگی	۔	تاریکی، اندھیرا
کھٹکا	۔	ڈر، شبہ
تعرض	۔	چھیڑ چھاڑ
کان کھڑے ہونا	۔	ہوشیار ہونا
درہم برہم ہونا	۔	ادھر ادھر ہونا، برباد ہونا
ضعف	۔	کمزوری
پراگندہ	۔	آلودہ، گردوغبار سے اٹا ہوا
صفت	۔	خوبی
گھڑی	۔	لمحہ، پل

آپ نے پڑھا

- زیرِ نصاب اقتباس ڈپٹی نذیر احمد کے ناول 'توبۃ النصوح' کے ایک اقتباس سے ماخوذ ہے۔ جس کا نقطہ نظر خا

اصلاحی ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ ان کے بیشتر ناول اصلاحی نقطہ نظر کے حامل رہے ہیں جس کا پس منظر یہ ہے کہ نذیر احمد کے زمانے میں اردو ناول نے ایک فن کی حیثیت اختیار نہیں کی تھی۔ اس لئے اپنے بچوں کی اخلاقی تعلیم کے لئے انہوں نے اخلاقیات اور بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق چند کتابیں لکھیں جو بعد میں اردو ناول کے فروغ کے لئے پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔

- ناول 'توبتہ النصوح' کا یہ اقتباس نصوح کی بیوی فہمیدہ اور منجھلی بیٹی حمیدہ کی آپسی گفتگو پر مشتمل ہے۔ جس میں تعلیم و تربیت خصوصاً دینی تعلیم کو گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔ جس کا بنیادی مقصد بچوں کے عبوری دور میں ان کا ذہنی اصلاح کرنا ہے۔ اس گفتگو میں بہت سے پہلو ایسے بھی آئے ہیں جن سے بالواسطہ طور پر دینی تعلیم سے متعلق بچوں کے ذہن کو بیدار کرنا ہے۔
- توبتہ النصوح کے مرکزی کردار خود نصوح ہیں اور اپنے خاندان کے مکھیا بھی ہیں جنہوں نے خاندان کے تمام افراد کی اصلاح کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ نصوح کے بڑے بیٹے کلیم کا کردار منفی جہت کا حامل ہے اور ایک لڑکی عالیہ بھی کلیم کی راہ کی ہی مسافر ہے۔ جبکہ نصوح کا دوسرا لڑکا سلیم اور حمیدہ و صالحہ مثبت خیالات کے حامل ہیں۔ نظریوں کے اس اختلاف میں اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. نذیر احمد کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
2. نذیر احمد کے کسی دو ناول کا نام لکھیے۔
3. فہمیدہ اور حمیدہ نصوح کی کون تھیں؟
4. نذیر احمد نے کس کی تعلیم و تربیت کے لئے ناول لکھے۔
5. زیر نصاب ناول کے اقتباس سے دو کرداروں کے نام لکھئے۔

مختصر سوالات

1. نذیر احمد کے بارے میں پانچ جملے لکھئے۔
2. فہمیدہ کے کردار پر مختصراً روشنی ڈالئے۔
3. اردو کے کسی پانچ ناول کا نام لکھئے۔
4. سرسید کے عناصر خمسہ کی حیثیت سے نذیر احمد کی خدمات پر روشنی ڈالئے۔

5. اصلاحی جذبے پر پانچ جملے لکھیے۔

طویل سوالات

1. نذیر احمد کی ناول نگاری کا جائزہ لیجیے۔
2. اردو میں ناول نگاری پر ایک مضمون لکھیے۔
3. زیرِ نصاب اقتباس کا مرکزی خیال پیش کیجیے۔
4. درج ذیل الفاظ سے جملے بنائیے:

نوع، قسم، ضد، بخار، ضابطہ، لفظ، ادب

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے اصلاحی ناول پر ایک مذاکرہ کیجیے۔
2. لائبریری جا کر اردو کے دس ناول نگاروں کی ایک فہرست بنائیے۔

مکتوب نگاری

مکتوب یا خطوط نگاری خیریت اور ایک دوسرے کے ساتھ تبادلۂ خیالات کا ایک موثر اور روایتی ذریعہ ہے۔ دور حاضر میں یہ ایک مقام پر اس لئے بھی مستحکم ہوا کہ اسے ادارہ جاتی طور پر اعتبار بخشا گیا۔ غالباً شیر شاہ سوری کے دور میں اس کو ابتدائی طور پر منظم کیا گیا۔ عہد مغل میں فارسی میں مکتوب نویسی کا رواج تھا۔ پچھلے تمام بادشاہ، امراء اور رؤسا کے خطوط جو بھی محفوظ ہیں وہ سب کے سب فارسی میں ہیں۔ شعرا کے تمام نثری کام فارسی میں ہی ملتے ہیں۔

غالب نے اپنے احباب کو خطوط اردو میں لکھنے شروع کیے۔ تنہا غالب نے ہی تمام عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں کو تقریباً ۹۰۰ مکتوب لکھے ہیں۔ ان کے خطوط کے دو مجموعے ان کی زندگی میں ہی شائع ہو گئے۔ اس کے بعد سرسید، حالی، شبلی، ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال، مہدی افادی، عبدالماجد دریابادی، پریم چند، فیض احمد فیض، صفیہ اختر وغیرہ کے خطوط کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

مکاتیب یا خطوط بالکل ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں کیوں کہ اس میں لکھنے والا اکثر اپنے دلی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے اور اپنے جذبات کو خطوط کی بیساکھی کے سہارے مخاطب تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ مکتوب نگار اپنے احوال و کوائف کے ساتھ ساتھ اپنی روایات، اپنی معاشرتی اور عصری حسیات تک اس میں مقید کر لیتا ہے، جو بعد میں ایک دستاویز کی شکل بن کر محفوظ ہو جاتے ہیں۔

اسداللہ خاں غالب

مرزا اسداللہ خاں غالب 27 / دسمبر 1797ء کو اپنی نانیہال آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ اور والدہ کا نام عزت النساء بیگم ہے۔ غالب بچپن میں ہی یتیم ہوگئے تو ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے انہیں اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ مولوی معظم کے مکتب میں غالب نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ وہیں سے ان کی شعرگوئی کی ابتداء ہوئی۔

ان کی شادی بھی کم عمری میں تقریباً 13 برس کی عمر میں الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ شادی کے فوراً بعد ہی انہوں نے دہلی میں سکونت اختیار کرلی۔ حالانکہ انہیں وہاں مالی پریشانیوں کا سامنا رہا۔ خاندانی پنشن کے سلسلے میں انہوں نے کلکتہ کا سفر بھی کیا۔ آخر میں جب باضابطہ وظیفہ قلعۂ معلیٰ سے جاری ہوا تو حالات کسی قدر بہتر ہوئے۔ مگر غدر نے ان کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ اسی پریشانی میں آخرکار 15 / فروری 1869 کو ان کا انتقال ہوگیا۔

غالب نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھا۔ اردو میں خطوط کے دو مجموعے 'عود ہندی' اور 'اردوئے معلیٰ' کے نام سے چھپے ہیں۔ وہ پہلے اسد تخلص کرتے تھے بعد میں غالب کرنے لگے۔

غالب نے اپنے مکتوب کے ذریعے اردو کو بیش بہا دولت سے نوازا ہے۔ ان کے مکتوبات میں بے تکلف اور سادگی سے لبریز ماحول ملتا ہے۔ لہجے کی تندی اور ظریفانہ رنگ سے ان کے خطوط میں ایک خاص اندازِ نظر پیدا ہوگیا ہے۔ ان کے خطوط بالکل مکالماتی انداز کے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ 'میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنادیا ہے'۔ ان کے خطوط سے ہمیں جہاں ان کے ذہنی رویے کی پرکھ ہوتی ہے وہیں ان کی شخصیت کے تہہ در تہہ پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔

سید شاہ کرامت حسین کرامت ہمدانی کے نام

دہلی، محلہ بلی ماراں

10 / جولائی 1860ء

شاہ صاحب کو غالب ناتواں کا سلام پہنچے۔ بھائی میرا کیا حال پوچھتے ہو۔ زندہ ہوں مگر مردے سے بدتر۔ حوادث زمانہ و عوارض جسمی سے نیم جاں ہو رہا ہوں۔ غذا کی حقیقت یہ ہے کہ صبح کو آٹھ دس بادام کا شیرہ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا پانی، دو گھڑی دن رہے دو یا تین تلے ہوئے کباب اور بس۔ نسیان حد سے گزر گیا ہوں۔ خط مع کلام اصلاح طلب بکس یا کتاب میں رکھ دیتا ہوں اور بھول جاتا ہوں۔ ایسی حالت میں اگر خط کا جواب یا اصلاحی غزل دیر میں پہنچے تو شکایت نہ کیا کرو۔ مجھے زندہ سمجھتے ہو جو تازہ کلام کی فرمائش کرتے ہو، غنیمت نہیں جانتے کہ مردہ کچھ لکھ کر بھیج دیتا ہے۔ سو روپے جو تم نے بھیجے وہ مجھے ملے۔ میں دوستوں کی خدمت گزاری میں کبھی قاصر نہیں رہتا۔ اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی۔ میں یوں ہی خدمت گذاری کو حاضر ہوں۔ جب چاہو اپنا کلام بھیجو۔ تمہاری تینوں غزلیں بعد اصلاح بھیجتا ہوں۔ چشم بددور، تمہاری طبیعت مناسب اس فن کے ہے۔ اللہ نگاہِ بد سے محفوظ رکھے۔

نجات کا طالب

غالب

ABDEL SOLUTIONS ABSOL PATNA

لفظ و معنی

ناتواں	-	کمزور
حوادث	-	حادثہ کی جمع، واقعہ ہو جانا

عوارضِ جسمی	۔	جسمانی بیماریاں
نیم جاں	۔	کمزور، آدھی جان
نسیان حد	۔	ذہن کے دریچے سے نکل جانا، بھول جانا
اصلاحی غزل	۔	اصلاح کے لئے دی گئی غزل، تصحیح کرنا، درست کرنا
کلام	۔	بات، مواد جو درستگی کے لئے پیش ہو
غنیمت	۔	کسی حد تک حاصل ہونا، قابل تشفی
خدمت گزاری	۔	دل جوئی کرنا، جذبات کا خیال رکھنا
چشم بد دور	۔	بری نظر دور ہو، بری نظر سے پناہ ہو
نگاہِ بد	۔	بری نظر

آپ نے پڑھا

- سید کرامت حسین کرامت ہمدانی کے نام غالب نے اپنے اس مکتوب میں اپنی محبت اور دوستی کو اس طرح واضح کیا ہے کہ میں کمزور ہوں، بیمار ہوں میرا حال کیا پوچھتے ہو۔ زندگی بس زندگی کی حد تک باقی ہے۔ غذا کے نام پر بادام کا شیرہ اور گوشت کا پانی۔ سرِ شام چند کباب سے جی کو سیر کیا جاتا ہے۔ ایسے میں کلام کی اصلاح ایک مشکل کام ہے مگر وہ اسے کر کے بھی علاحدہ رکھ کر بھول جاتے ہیں۔ اب ایسی حالت میں جو کام ہو جاتا ہے وہی غنیمت ہے اور لائق شکر یہ ہے کہ وہ اس کو کسی طرح اصلاح کر ڈالتے ہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ان کا بھیجا ہوا سو روپیہ مل تو گیا مگر دوستی میں اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ان کی طبیعت شاعرانہ ہے اس کے لئے انہیں مبارک باد دی گئی ہے اور سراہا گیا ہے اور بری نظر سے بچے رہیں اس کی دعا کی گئی ہے۔
- اس مکتوب کی زبان انتہائی رواں، صاف شفاف اور دلکش ہے۔ ایک ایسے شخص نے جس نے فارسی میں بہترین شاعری کی ہو اپنے عہد میں عمدہ اور با محاورہ زبان کا استعمال کیا ہے جو آج کے تناظر میں بھی اسی طرح اہم اور کلیدی حیثیت رکھتی ہے اور ہم ترسیل و ابلاغ کے مرحلے سے آسانی سے گذر جاتے ہیں۔ ایک انسان جب دوسرے کو اپنی باتیں کہتا ہے تو اس تک پہنچنے کی یہ اولین شرط ہوتی ہے کہ اگلا اس کی زبان کو سمجھ رہا ہے یا کہ نہیں۔ غالب کو اس میں کمال کا درجہ حاصل ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. غالب کی سنہ پیدائش کیا ہے؟
2. غالب کہاں پیدا ہوئے؟
3. غالب کے خطوط کے کسی ایک ایک مجموعہ کا نام لکھیے۔
4. غالب نے کتنے خطوط لکھے؟

مختصر سوالات

1. مکتوب نگاری کے فن سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔
2. غالب نے اپنے خطوط میں کن باتوں کا اظہار کیا ہے؟
3. غالب نے اپنے خط میں دوستی اور محبت کا اظہار کن لفظوں میں کیا ہے؟
4. غالب کا تعارف مختصراً لکھیے۔
5. غالب کے خطوط کی زبان پر پانچ سطریں لکھیے۔

طویل سوالات

1. غالب کے لکھے ہوئے خطوط کس نوعیت کے ہیں؟
2. غالب کے علاوہ کن قلم کاروں کے مکاتیب کتابی شکل میں شائع ہوئے؟
3. غالب کے خطوط سے اردو نثر کو کیا فائدہ پہنچا؟
4. مکتوب نگاری کے کیا فائدے ہیں؟

آیئے، کچھ کریں

1. غالب کی طرز میں کسی موضوع پر اپنے دوست کے نام ایک خط لکھیے۔
2. غالب کی خطوط نگاری کے موضوع پر اپنی جماعت میں تقریر کیجیے۔

عبدالغفور شہباز

پورا نام سید محمد عبدالغفور اور شہباز تخلص تھا۔ شہباز موضع سرمیرا، باڑھ کے رہنے والے تھے۔ 'سفینۂ اردو' میں انہیں آرہ کا باشندہ بتایا گیا ہے جو درست نہیں ہے۔ انہوں نے بہت کم سنی میں لکھنا شروع کیا۔ اپنے مظفرپور کے قیام کے دوران انہوں نے انٹرنس پاس کیا اور عربی و فارسی میں مہارت حاصل کرلی۔ اس کے علاوہ انگریزی کے بھی خندہ اں ہوگئے۔

بیس سال کی عمر میں ان کی شادی شمس النساء خاتون ساکن باڑھ (پٹنہ) کے ساتھ ہوئی۔ ان کی بیگم دس برسوں کی رفاقت ہی دے پائیں۔ اس کے بعد انہوں نے دوسری شادی مولوی بشیر الدین احمد فرزند ڈاکٹر نذیر احمد کی سالی اشرف النساء سے 1898ء میں کی۔ وہ خوش حال گھرانے سے تھے مگر بعد میں ان کی حالت کچھ اچھی نہیں رہی۔ جس کے باعث ان کی انگریزی کی تعلیم متاثر ہوئی۔ بہرحال اپنے بھائی کی وساطت سے وہ سب رجسٹرار ہوگئے۔ پھر ان کا مضمون نگاری کا شوق پھلنے پھولنے لگا۔ اردو اخبار 'دارالسلطنت' 1880ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر اہتمام شروع ہوا تو اس میں مدیر ہوگئے۔ اس کے بند ہونے کے بعد انہوں نے پٹنہ کے بی این کالج میں داخلہ لیا۔ اودھ پنچ (لکھنو)، البنچ (پٹنہ)، مخزن (لاہور) اور اودھ اخبار (لکھنؤ) میں لکھنے لگے۔ بھوپال کی بیگم صاحبہ کو ان کے علم و کمال کا علم ہوا تو بھوپال آنے کی دعوت دی گئی۔ وہاں وہ 1905ء میں ناظم تعلیمات ہوگئے۔ بیگم بھوپال کی کچھ شرطیں تھیں جو انہیں نامنظور تھیں۔ اپنی دوسری اہلیہ کے انتقال کے بعد وہ نہ اورنگ آباد کالج کے پروفیسر رہے اور نہ بھوپال کی ڈائرکٹری کے رکن۔ اسی کسمپرسی کی حالت میں وہ سخت علیل ہوگئے اور 30 رنومبر 1908ء کو اس دارفانی سے کوچ کرگئے۔

شہباز نے مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی۔ ان کے کلام میں رباعیات شہباز، خیالات شہباز، تفریح القلوب اور باقیات شہباز میں مناظرہ دین و دنیا، قرآن السعدین، سالگرہ مبارک حضور نظام الدین، خدا کی رحمت، عید سعید، عروس شادی، نوحہ، تین خمسے، تہذیب قیس، قانون قسمت وغیرہ جیسی نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ کلیات نظیر اکبرآبادی، مقدمہ موعظہ حسنہ، مصنفہ ڈاکٹر نذیر احمد، مقدمہ خیالات آزاد، مقدمہ سوانح عمری مولانا آزاد، دیباچہ نوابی دربار، دیباچہ نوابی کھیل، مقالات جمالیہ، ترجمہ رد نیچری، سیرت خسروی اور زندگانی بے نظیر ان کی تصنیفات و تالیفات میں شامل ہیں۔

شہباز نئی تعلیم و تہذیب کے دلدادہ تھے اور پیروئی مغربی کی دعوت عام دیتے تھے۔ شہباز نظیر، حالی اور اکبر کے مقلد اور پیروکار ہیں۔ سائنسی علوم سے بھی کافی رغبت رکھتے تھے۔ پیش نظر مکتوب ان کے مکاتیب سے ماخوذ ہے۔

اپنی بیٹی صغریٰ کے نام

کیوں جی صغریٰ! تمہاری اماں خط کیوں نہیں لکھتیں؟ مزاج تو ان کا اچھا ہے امید ہے تمہارا سبق ناغہ نہ ہوتا ہوگا۔ حقوق اولاد کے شعر جب تم زبانی پڑھتی تھیں اور تمہاری چھوٹی بہن بھی ساتھ ساتھ پڑھنا چاہتی تھی، دونوں کے حق میں میرے دل سے دعا نکلتی تھی۔ بشریٰ کو تم مراۃ العلم تھوڑا تھوڑا پڑھاتی رہو تو اچھی بات ہے۔ میں نے تمہاری اماں کو پڑھایا۔ وہ ماشاء اللہ تم کو پڑھاتی ہیں۔ تم بھی اگر بشریٰ کو پڑھاؤ تو کیا مضائقہ ہے۔ حقوق اولاد جب تم تمام کرلوگی میں تم کو ضرور انعام دوں گا۔ راہ نجات کے تمام ہونے میں ابھی بہت دیر ہے۔ اس کے انعام کا وعدہ ابھی سے کرنا فضول ہے۔ میں، خدا نے چاہا تو، محرم کی تعطیل میں آؤں گا۔ دیکھو تیار رہنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے سامنے اپنی کتاب ٹھیک سے نہ پڑھ سکو۔ اخلاق ہندی کا آموختہ تم روز نہیں پڑھتیں۔ بھئی یہ بات اچھی نہیں۔ اگر چھوڑ دوگی بھول جاؤ گی اور کی کرائی محنت برباد ہوگی ادھر میں اصغری کو دیکھنے نہیں گیا مگر نہیں گیا تو کیا ہوا۔ لوگوں سے تو معلوم ہوتا رہتا ہے کہ وہ غضب کی ترقی کر رہی ہے، تم کو اگر شوق ہو اور محنت کرو تو دو چار مہینے میں اب بھی تم اس کو سبق دے سکتی ہو۔ مجھ کو چار پانچ روز سے ایک دنبل سخت ستا رہا ہے۔ اب کسی قدر آرام ہے۔ میں نے یہ خط صاف صاف لکھا ہے۔ یقین ہے غور کروگی تو بغیر کسی کی مدد کے آپ پڑھ لوگی۔ بشریٰ کو دعا کہو اور اپنی انانی کی خدمت میں تسلیم۔

عبدالغفور (شہباز)

لفظ و معنی

باشندہ	۔	رہنے والا، جس جگہ پر قیام ہو
تخنداں	۔	جانکار ہونا، کسی خاص موضوع سے واقف ہونا
ساکن	۔	رہنے والا خاص مقام کا

رفاقت - دوستی، صحبت، ساتھ دینا

خوش حال گھرانہ - اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھنا

باعث - وجہ

وساطت - ذریعہ ہونا، کسی کے ذریعے سے، کسی واسطے سے

ناظم تعلیمات - ڈائرکٹر ایجوکیشن

علیل - بیمار ہونا

پیروی مغربی - مغربی تہذیب کی نقل کرنا

رغبت - دلچسپی رکھنا

سائنسی علوم - علم سائنس کی جانکاری رکھنا

مقلد - تقلید کرنے والا، نقل کرنے والا

پیروکار - کسی کی بات ماننے والا، کسی کی باتوں کو اپنی زندگی میں اتارنا

آپ نے پڑھا

- سطور بالا میں عبدالغفور شہباز کا مکتوب آپ نے پڑھا۔ جسے انہوں نے اپنی بیٹی صغریٰ کو لکھا اور دریافت کیا ہے کہ ان کی والدہ یعنی خود ان کی بیگم انہیں خط کیوں نہیں لکھتیں؟ اور یہ کہ وہ خود اپنا سبق یاد کر رہی ہے کہ نہیں؟ اپنی دونوں بیٹیوں کے لئے وہ دعا کرتے ہیں کہ وہ پڑھ کر بہتر سے بہتر زندگی کے لئے تیار ہو جائیں۔ کیوں کہ اگر وہ اولاد کا حق ادا کر لیتی ہے تو وہ ضرور انعام پائے گی۔ وہ محرم کی چھٹیوں میں ضرور ان کے پاس آئیں گے۔ اب اگر اس وقت وہ سبق صحیح طور پر ادا نہ کر سکیں تو مشکل ہوگی اور انعام بھی جاتا رہے گا۔ کیوں کہ شوق اور محنت کے ذریعہ ہی انسان بلندیوں کو پہنچ سکتا ہے۔ خود وہ کسی زخم سے پریشان رہے ہیں مگر فی الوقت آرام ہے۔ خط اس لئے بھی بہت صاف صاف لکھا ہے کہ ان کی بیٹی اسے شوق سے اور جلد سے جلد پڑھ ڈالے اور اس میں اس کو کسی کی مدد نہ لینی پڑے۔

مختصر ترین سوالات

1. شہباز کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

2. شہباز کی کتنی شادیاں ہوئیں اور ان کی بیویوں کے نام کیا ہیں؟
3. شہباز کی دو کتابوں کے نام بتائیے۔
4. شہباز نے شاعری میں کن شعرا کی تقلید کی ہے؟
5. شہباز نے شاملِ نصاب مکتوب میں جس بچی کو مخاطب کیا ہے اس کا نام لکھیے۔

مختصر سوالات

1. شہباز کی تصنیفات پر روشنی ڈالیے۔
2. شہباز کے بارے میں پانچ جملے لکھیے۔
3. مکتوب نگاری کی مختصر تعریف لکھیے۔
4. شاملِ نصاب خط کیا شہباز کا ذاتی خط ہے؟ اس پر روشنی ڈالیے۔
5. شہباز نے اپنی بیٹی کو جس بات کی تلقین کی ہے، اسے اجاگر کیجیے۔

طویل سوالات

1. اردو میں مکتوب نگاری کی ابتدا و ارتقاء پر روشنی ڈالیے۔
2. شہباز کی شخصیت پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
3. شاملِ نصاب مکتوب شہباز کا خلاصہ پیش کیجیے۔
4. مندرجہ ذیل الفاظ سے جمع بنائیے۔

حق، فن، قبر، منزل، دلیل، ولی، امت

آئیے، کچھ کریں

1. خطوط نگاری کے روبہ زوال رجحان پر ایک مذاکرہ کیجیے۔
2. اپنے استاد کی مدد سے اردو مکتوب نگاروں کی فہرست تیار کیجیے۔

مہدی افادی

مہدی افادی کا اصل نام مہدی حسن ہے۔ ان کی پیدائش 1828ء میں گورکھپور میں ہوئی۔ ان کا تعلق معزز شیوخ گھرانہ سے تھا۔ ان کے والد انتہائی مذہبی آدمی تھے۔ البتہ پیشے کے اعتبار سے کورٹ انسپکٹر پولس تھے۔ ان کا نیک اور ہردل عزیز رؤسائے شہر میں شمار ہوتا تھا۔

ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ انگریزی اور فارسی میں مہارت حاصل کی۔ مہدی افادی کی تین شادیاں ہوئیں۔ تیسری بیگم عظیم النساء تھیں جو بیگم مہدی کے نام سے معروف تھیں۔

مہدی افادی کے مضامین روشن خیالی کا تصور فراہم کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان میں جذبات اور احساسات کی کیفیات بھی بے پناہ ہیں۔ ان کے مضامین میں دلکشی بہت زیادہ ہے۔ مہدی نے حالی کے تخلیقی ذہن کی بڑی داد دی ہے لیکن اس کے باوجود اس خیال کو تجلک ہونے سے بچایا ہے۔ مہدی کی نظر حسن وعشق کے معاملات پر رہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ایک مضمون بعنوان 'فلسفۂ حسن وعشق: یونانیوں کے نقطۂ نظر سے' مرتب کیا ہے۔

مہدی افادی کے تصورات تضادات کے شکار معلوم ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو رومانی تحریک کا اثر ان کے ذہن پر پڑا تو دوسری طرف بوجوہ اس سے اختلاف کی نوعیت بھی ابھرتی رہی۔ لیکن یہ درست ہے کہ انہوں نے خود محسوس کیا تھا کہ آج کی نسل کا ذہن 'تہذیب الاخلاق' کا پیدا کردہ ہے۔ تحریک کا اثر خود ان کی شخصیت کی تعمیر کا ایک حصہ ہے۔ چونکہ جذباتی احساسات ان کے دل کو مسلسل متاثر کرتے رہے تھے، اس لئے تعقل پسندی کہیں کہیں رد ہوتی نظر آتی ہے۔ یہ تضاد دراصل دل اور دماغ کی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ مہدی افادی اپنی بوقلمونی طبع کے سبب آج بھی پڑھے جاتے ہیں۔

مولوی سید مقبول احمد صمدانی کے نام

پیارے مقبول!

آپ کے خوش سواد نکتہ خیز اور لطیف عنایت نامہ کی اگر داد دیتا ہوں تو اس لحاظ سے کہ آپ نے نقاد کے 'صحافی' کو سراہا ہے۔ ہم دونوں 'حاجی' ہوئے جاتے ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ آپ کے دائرہ نظر میں ہونا وہ بھی ادبی حیثیت سے میری کاوشوں کا، اگر وہ دراصل لائق اعتراف ہوں، ایک ایسا قیمتی صلہ ہے، جس سے دنیا کا بڑے سے بڑا مصنف بھی مستغنی نہیں ہوسکتا۔ میں تو صرف حاشیہ نشینوں میں ہوں۔ بھئی 'یاد ایام' سے آپ نے میرے دل پر چوٹ لگائی۔ اب وہ پہلا سا جوبن کہاں، وہ کساؤ اور رکھ رکھاؤ کہاں؟

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہوگئے خاک انتہا یہ ہے

پچھلی تصویر کا ایک خاکہ رہ گیا ہے جسے مشکل سے پہچانئے گا۔ دور سے بیٹھے قصے سنا کیجئے اور یہ بات ہے! بڑھاپے میں بھی پرستاروں کی کمی نہیں! اس سے خوش ہوا۔ کیسا فرق مرتبت، یہ تو بننے والوں کی گڑھی ہوئی اصطلاح ہے۔ اصیل مرغ کی ایک ٹانگ! مجھے میرے چاہنے والے ویسا ہی پائیں گے، جیسا پچھلی صدی میں تھا۔ کچھ خبر بھی ہے؟ حسن وعشق کی فتنہ گری جس نے کی تھی وہ سایہ کی طرح ساتھ ہے اور 'فتوحات' کا سلسلہ ہے کہ قائم ہے۔ آپ کو پوچھنی ہے کہ کون بزرگ ہیں۔ کیا بتاؤں بڑھی ہوئی داڑھی کے ساتھ پیشی کے لائق نہیں رہے۔ اچھا میرے پرستان تک کب آیئے گا۔ آپ کی توفیق تو دیکھ لی۔ لیکن مجھے 19 کے بعد اور بڑے دن سے پہلے ضرور بلایئے کہ ضابطہ کا سلام تو ہو جائے۔ بڑے صاحب کی زیارت کے بعد ذرا آپ کو تفصیل سے دیکھ لوں گا۔

مہدی

لفظ و معنی

خوش سواد	۔	مزے دار، دلچسپ
نکتہ خیز	۔	نکتہ پیدا کرنے والا
لطیف	۔	نازک، سبک
عنایت نامہ	۔	خط، مکتوب، یاد آوری کرنا
نقاد	۔	تنقید کرنے والا
صحافی	۔	جو تہذیب و ثقافت پر نظر رکھتا ہو
حاجی	۔	جو حج کر چکا ہے
دائرہ نظر	۔	نظر میں رکھنا
کاوشوں	۔	کوششوں
لائق اعتراف	۔	اعتراف کے قابل
یاد ایام	۔	گزرے دنوں کی یاد
مستغنی	۔	بے نیاز ہونا، کسی سے کوئی مطلب نہ ہونا
جوبن	۔	جوانی
ابتدائے عشق	۔	شروعاتی دنوں کا عشق
خاکہ	۔	عکس، تصویر
پرستار	۔	چاہنے والا، شیدا
مرتبت	۔	درجہ، مرتبہ، اعلیٰ مرتبہ رکھنے والا
گڑھا ہوا	۔	بنایا ہوا، وضع کیا گیا
اصطلاح	۔	مخصوص معنی کے لئے بنایا گیا لفظ
اصیل مرغ کی ایک ٹانگ	۔	کسی بات پر سختی سے قائم رہنا، ضد کرنا

فتنہ گری ۔ فساد پیدا کرنے والا، معشوق، چاہنے والا

فتوحات ۔ فتح کی جمع، جیت

پیشی ۔ حاضری، سامنے لانا

پرستان ۔ جہاں پریوں کا قیام ہو، اپنے دولت کدہ سے مراد، پریوں کے رہنے کی جگہ

زیارت ۔ کسی متبرک مقام یا کسی بزرگ کو دیکھنا

آپ نے پڑھا

- مہدی افادی نے اپنے دوست مولوی سید مقبول احمد صمدانی کے نام لکھے اس خط میں ان کے ذریعہ سراہے گئے اقدامات کی تعریف کی ہے۔ اس خط میں انہوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ عمر کے اس مرحلے پر جبکہ دونوں حاجی ہوئے جاتے ہیں، چھ باتیں جو دائرہ لائق اعتراف میں ہوں، ان کی ستائش ضروری ہے۔ کیوں کہ حاشیہ نشیں خود کو سمجھ رہے ہیں اور دیرینہ یادوں سے دل کو تکلیف پہنچتی ہے کیوں کہ بہرحال عمر ایک بہت بڑی وجہ ہوتی ہے اور انسان اپنی تیزی اور طرّاری بھول جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ابتدائی دنوں میں جوش و ولولہ اس قدر تھا کہ آگ ہی آگ بھری لگتی تھی۔ انسان کی ایک عمر ہوتی ہے جب وہ کافی چاق و چوبند ہوتا ہے۔ مگر کچھ تو حالات کے تقاضے اور کچھ گزرے ہوئے وقت کے ساتھ، اس کے جسم کی کساوٹ اور اس کی تیزی سے گرتی ہوئی حالت میں ہوتی ہے۔ حالانکہ بڑھاپے میں بھی پرستاروں کی کمی نہیں ہوتی اور پذیرائی کے عوض وہ خود کو اسی طرح پیش بھی کرتے ہیں۔ اپنی شریک سفر کے بارے میں کہتے ہیں کہ جنہوں نے انہیں دام الفت میں گرفتار کیا تھا وہ آج بھی سایہ کی طرح ساتھ ہیں اور اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑے ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے دوستوں سے انسان اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتا ہے اور ڈھکی چھپی باتیں بھی بتاتا ہے۔ اپنے خط میں ملاقات کی طرف نشاندہی کی گئی ہے کہ اس کے لئے خاص فرصت نکالی جائے اور باضابطہ سلام دعا ہو جائے۔

مختصر ترین سوالات

1. مہدی افادی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
2. مہدی افادی نے کتنی شادیاں کی تھیں؟
3. مہدی افادی کو اردو کے علاوہ کن کن زبانوں میں مہارت حاصل تھی؟

4. مہدی افادی کی بیگم کا نام کیا تھا اور وہ کس نام سے مشہور تھیں۔

5. مہدی افادی کا اصل نام کیا ہے؟

مختصر سوالات

1. مکتوب کی تعریف کیجئے۔

2. مہدی افادی کے بارے میں پانچ جملے لکھئے۔

3. مہدی افادی نے اپنے خط میں کس کو مخاطب کیا ہے اور وہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

4. درج ذیل محاوروں کے معنی لکھئے۔

زیروزبر ہونا، آنکھ دکھانا، ہتھیلی پر سرسوں جمانا

5. درج ذیل الفاظ کے اضداد بتائیے:

جسم، دنیا، حق، غربت، نشیب، حسن، ایمان

طویل سوالات

1. مکتوب نگاری کے آغاز وارتقاء پر روشنی ڈالئے۔

2. مہدی افادی کی مکتوب نگاری کا فنی جائزہ لیجئے۔

3. غالب اور مہدی افادی کے خطوط کے فرق کو واضح کیجئے۔

4. مہدی افادی کا مختصراً تعارف پیش کیجئے۔

5. مہدی افادی کے مضامین کی خصوصیات بیان کیجئے۔

آئیے، کچھ کریں

1. اپنے استاد سے مکتوب نگاری کے فن پر معلومات حاصل کیجئے۔

2. اپنے ساتھیوں کی مدد سے اردو مکتوب نگاروں کی فہرست تیار کیجئے۔

انٹرویو

کسی خاص موضوع پر دو اشخاص کی گفتگو یا ملاقات کے دوران آپسی بات چیت کو انٹرویو کہا جاتا ہے۔ آج کے دور میں اس کی کافی اہمیت اور افادیت ہے۔ اس سے انسان کی شخصیت کی مختلف جہات کا تجزیہ آسانی کے ساتھ کرلیا جاتا ہے۔ یہ ایک مقصدی مکالمہ ہے جس سے انٹرویو لینے والا شخص اپنے سامنے بیٹھے ہوئے کی سیرت وصورت، گہرائی و گیرائی، میلان، نفسیات و اطوار کا تجزیہ مکالمہ کے ذریعہ کرتا ہے۔ انٹرویو ہنوز اصناف اردو ادب میں اپنا مقام نہیں بنا سکا ہے لیکن عنقریب اردو کے نثری اصناف میں اس کی شمولیت ممکن ہے۔

راجندر سنگھ بیدی

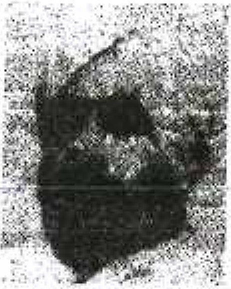

عہد حاضر کے چند بلند پایہ افسانہ نگاروں میں راجندر سنگھ بیدی کا شمار ہوتا ہے۔ وہ انسانی نفسیات کے نباض ہیں۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتیں ان کے افسانوں کا موضوع بنتی ہیں۔ بیدی کی پیدائش یکم ستمبر 1915ء کو لاہور میں ہوئی۔ بیدی کا سب سے بڑا کمال ان کے فن کی صناعی ہے۔ اپنے افسانوں کے کرداروں کو وہ اس طرح سے تراشتے ہیں جیسے ایک سنگ تراش پتھر کے ٹکڑوں کو اپنی چھینی سے تراش کر زندہ اور روشن وجود میں بدل دیتا ہے۔ ان کے افسانوں میں سب سے زیادہ چہل پہل ان کے کرداروں کی پیدا کی ہوئی ہے۔ ان کے کرداروں میں تخیل کی رنگینی اور پختہ کاری ہے۔ بیدی نے نئی تشبیہیں اور نئے اشارے بھی وضع کیے ہیں۔ گہری جذباتیت کرداروں کی تحلیل، نفسیاتی تجزیہ اور پس منظر میں سچی زندگی، یہی سب ان کے موضوع اور فنی عناصر ہیں۔ ان کی افسانوی فکر کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ان کے کرداروں کے خمیر و خمیر کا نہ صرف حصہ بن جاتی ہے بلکہ ایک عجب طرح کی سرشاری کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔

بیدی نے اپنے افسانوں کا مواد متوسط طبقہ سے لیا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ زندگی کے تلخ ترین حقائق کی ترجمانی بڑی سلاست روی کے ساتھ کی ہے۔ یہ بیدی کی خوش بختی ہی تھی کہ ان کے پہلے افسانوی مجموعہ 'دانہ و دوام' نے ہی اردو ادب کی دنیا میں دھوم مچا دیا۔ خواجہ غلام السیدین جیسے نابغۂ روزگار بھی بیدی کی عظمت کے قائل تھے۔ ان کے علاوہ بیدی کے ہم عصر خواجہ احمد عباس تو بیدی کو اردو افسانہ کا ناخدا قرار دیتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ فن اور مواد کے اعتبار سے اگر اردو کے دو بڑے لکھنے والوں کا نام لیا جائے تو ان میں ایک بیدی کا ہی نام ہوگا۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور مختلف دانش گاہوں کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔ افسانوی ادب کے اس منفرد فنکار کا 11 رنومبر 1984ء کو انتقال ہو گیا۔

بیدی سے انٹرویو

اردو کے عظیم افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کے ساتھ یہ انٹرویو 6 رجولائی 1984ء کو ان کی قیام گاہ پر آل انڈیا ریڈیو ممبئی کے لئے صدا بند کیا گیا تھا۔ یہ بیدی کا آخری انٹرویو ہے جو انہوں نے اپنی زندگی میں ریکارڈ کرایا تھا۔ اس انٹرویو کی اہمیت اس بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں زیادہ تر سوالات عصمت چغتائی نے کئے ہیں۔ اس انٹرویو کا مختصر خاکہ ہی یہاں پیش کیا گیا ہے۔

انٹرویو لینے والوں کا تعارف:

عصمت چغتائی اردو ادب کی مشہور و ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ وہ مشہور مزاح نگار عظیم بیگ چغتائی کی بہن ہیں۔ ان کی شاہکار کہانیوں اور ناولوں نے اردو ادب کے سرمایہ میں کافی اضافہ کیا ہے۔ دونوں اصناف میں فنی اعتبار سے ان کا مرتبہ و مقام خاصا بلند ہے۔

فیاض رفعت ان کا تعلق آل انڈیا ریڈیو سے ایک طویل مدت تک رہا ہے اور اسٹیشن ڈائرکٹر کے عہدے پر بھی سرفراز رہے ہیں۔ اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمات کے سلسلے میں لائق ستائش رہے ہیں۔

SOLUTIONS ASSOL PATNA

فیاض : بیدی صاحب! ہم لوگ آل انڈیا ریڈیو سے حاضر ہوئے ہیں اور آپ کا تعلق بھی آل انڈیا ریڈیو سے رہا ہے۔ 1948ء میں آپ اسٹیشن ڈائرکٹر بھی رہے ہیں۔ لیکن اس سے الگ آپ کا ایک مرتبہ ہے، بڑا قد ہے اور اردو افسانے میں آپ کا بہت بڑا نام ہے۔ ایک زمانہ سے جی چاہتا تھا

کہ آپ سے بیٹھ کر باتیں کریں، کچھ پوچھیں آپ سے افسانے کے بارے میں، کہانی کے بارے میں، زندگی کے بارے میں۔ عصمت آپا آپ سے زیادہ آسانی سے بات کر پائیں گی۔

بیدی : ٹھیک ہے، عصمت آپا شروع کریں گی اور میں جواب دوں گا۔

عصمت : ایک دفعہ ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ راجندر سنگھ بیدی کی زبان کے بارے میں آپ کا خیال ہے؟ میں نے کہا، 'بہت کم اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں بہت کچھ کہتے ہیں۔'

بیدی : یہ آپ کی نوازش ہے، شروع میں خامی تھی، اسے میں نے آہستہ آہستہ ٹھیک کیا ہے۔

عصمت : میں سمجھتی ہوں وہ کوئی خامی نہیں ہے۔

بیدی : اِن دنوں میری اردو کافی اچھی ہے، اور میں سمجھتا ہوں اس میں کوئی خامی نہیں نکال سکتا۔

فیاض : اچھا بیدی صاحب! میں سمجھتا ہوں، لاہور میں جب آپ پوسٹ آفس میں کام کرتے تھے، اس زمانے میں ہی آپ نے پہلا افسانہ لکھا۔ تو وہ افسانہ لکھنے کی تحریک آپ کو کیسے ملی؟ اور وہ افسانہ کون سا تھا اور وہ کہاں شائع ہوا تھا؟

بیدی : دیکھئے، وہ افسانہ تھا 'مہارانی کا تحفہ' وہ ضائع ہوگیا۔ وہ میں نے ٹیگور کے رنگ میں لکھا تھا اور اسے سال کا بہترین افسانہ قرار دیا گیا تھا۔

فیاض : میں سمجھتا ہوں بیدی صاحب! افسانے میں جو زبان ہوتی ہے وہ آرائشی زبان نہیں ہونی چاہیے، وہ تو اس کیریکٹر کی زبان ہونی چاہئے جو وہ بول رہا ہے...... یہ تو ادیب کی تخلیقیت ہوتی ہے۔ بڑا ادیب تو اپنی زبان خود لے کر پیدا کرتا ہے۔ اس صورت میں ادیب پر اعتراض بالکل بے جا ہے۔

بیدی : کسی کے افسانہ پر رائے دینی ہو تو آج کل کہا جاتا ہے...... افسانہ بہت اچھا ہے...... بہت گریٹ ہے، مگر زبان......؟ یہ زبان سنتے سنتے تو میں عاجز آ گیا ہوں۔ پھر میں تو وہی الفاظ استعمال کرتا ہوں جو میرے ذہن میں آتے ہیں۔

فیاض : اچھا بیدی صاحب! آپ کے افسانوں میں جو میں نے محسوس کیا کہ پچھلے چند برسوں میں آپ کے افسانوں میں Hindu Mythology (ہندو مذہبی عقائد) نمایاں ہے۔ آپ کے یہاں جو یہ

ایک نئی چیز پیدا ہوئی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

بیدی : وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں بیشتر لوگ مسلمان کردار ہی لاتے ہیں۔ میں نے سوچا، پورے ہندوستان میں اتنے ہندو ہیں ان کا نام اگر لیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ اس کے علاوہ میرے افسانوں کے کردار مسلمان بھی ہیں جیسے 'تعطّل'۔

عصمت : اچھا ایک کہانی تم نے بڑی خوبصورت لکھی تھی کہ ایک لڑکی کہیں پر جاتی ہے تو ایک بوڑھا آدمی موڑ میں اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے...... وہ بہت خوبصورت کہانی تھی...... ہاں! وہ بوڑھا دیکھتا رہتا ہے اور وہ لڑکی بہت غصہ میں ہوتی ہے کہ یہ بڈھا کون میرے پیچھے پڑ گیا ہے...... یہ بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بوڑھا اس کے لئے پیغام لاتا ہے اپنے بیٹے کا......۔

بیدی : بیٹے کا پیغام لاتا ہے، لیکن وہ لڑکی سمجھتی نہیں ہے اور اس کی ہر بات کا جواب جلی، کٹی ہوئی دیتی ہے۔ پھر ایک رشتہ آتا ہے اور وہاں شادی ہو جاتی ہے۔ سسرال میں اس سے کوئی کہتا ہے، 'بیٹا تم بہت خوبصورت تھیں، تندرست تھی نا! جیتی رہو۔ پھر وہ منہ اٹھا کر دیکھتی ہے۔ وہ تو وہی بڈھا ہے۔'

فیاض : بیدی صاحب! آپ فلموں کے ساتھ وابستہ رہے ہیں اور اس میں آپ کا اپنا تجربہ بھی کافی ہے۔ دستک، گرم کوٹ، دیوداس، مرزا غالب اور مدھومتی وغیرہ بڑی خوبصورت فلمیں بنائی ہیں۔

بیدی : بجا ہے۔ فلمی دنیا ادبی دنیا نہیں ہوتی۔ تجارتی دنیا ہوتی ہے۔ مجھے اس دنیا کا کافی تلخ تجربہ ہے اور اب مزید اس تجارتی دنیا کا تجربہ نہیں چاہتا۔

عصمت : ہم لوگ بمبئی میں رہتے ہیں نا...... بمبئی میں لوگ فلموں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔

بیدی : آپ کا کہنا درست ہے۔ بمبئی کا بازار ہی فلمی ہے۔ لوگوں کی اکثریت کا مزاج بھی فلمی ہے۔ میری کہانیوں پر فلمیں بنی ہیں لیکن میں فلم بینی کا شوقین نہیں۔ اب تو نہ محبوب جیسے ڈائرکٹر ہیں اور نہ یعقوب جیسا کیریکٹر۔ پہلے کہانی پر فلم بنتی تھی۔ اب تو کیریکٹر اور اداکاروں کے مطابق کہانی لکھنے والے بمبئی کے بازاروں میں ملنے لگے ہیں۔

فیاض : بیدی صاحب! آپ کے ڈراموں کا بھی ایک مجموعہ موجود ہے، 'سات کھیل'۔ ادھر ہمارے یہاں

اردو میں ڈرامہ ہی نہیں ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہمارے ہاں ڈرامہ صنف کی حیثیت سے بھی زیادہ مضبوط اور استوار نہیں ہے؟

بیدی : ڈرامے کی جس قسم کی Length (طوالت) ہونی چاہیے، اتنی نہیں ہے۔ ہم لوگوں نے بغیر تجربہ حاصل کیے ڈرامے لکھے۔

عصمت: یعنی وہ ڈرامے اسٹیج نہیں کیے جاسکتے؟

بیدی : جی ہاں۔ ڈرامے بہت عمدہ ہیں لیکن اسٹیج نہیں کیے جاسکتے۔

عصمت: ہمارے ہاں جیلانی بانو کا ناول 'ایوان غزل' بہت اچھا ہے۔

بیدی : پاکستانی مصنفوں نے ناول کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ میں نے بھی ایک چھوٹا سا ناول لکھا ہے۔ 'ایک چادر میلی سی' بس وہ لکھ کے بیٹھ گیا۔

فیاض : بیدی صاحب! ہمیں آپ کی علالت کا احساس ہے لیکن اگر آپ لاہور کی کچھ یادیں دہرادیں تو ہمارے سامنے آپ کی پوری زندگی آجائے گی۔

بیدی : بھئی سب سے پہلے تو اوپندر ناتھ اشک میرے دوست تھے۔ ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا تو وہ زیادہ تر میرے گھر میں پڑے رہتے تھے۔ کرشن کی بابت...... میں نے ان کی کہانیاں پڑھیں تو بہت متاثر ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راستے سے کوئی آدمی گزرتا، تو میں اس سے پوچھتا تھا کہ 'آپ کرشن چندر ہیں۔' پنجاب پبلک لائبریری گیا تو پتہ چلا کہ وہاں ایک Carear رسالہ شائع ہوتا ہے اور اس کے اڈیٹر کرشن چندر ہیں۔ میں وہاں گیا اور میں نے کہا، 'آپ کرشن چندر ہیں؟' وہ کہنے لگے۔ 'تم راجندر سنگھ بیدی ہو؟' اور پھر ہم دونوں گلے مل گئے۔

فیاض : اچھا بیدی صاحب! آپ کی سعادت حاصل ہوئی۔ آج کی گفتگو یہیں پر ختم۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔

لفظ و معنی

نفسیات ۔ احساسات، جذبات اور میلان کی جانکاری

نباض	۔	نبض کی چال اور رفتار اور کیفیت کو پرکھنے والا
صناعی	۔	کاریگری
عناصر	۔	عنصر کی جمع، اجزاء
ضمیر	۔	دل، نفس
خمیر	۔	مٹی
متوسط	۔	درمیانی
تلخ	۔	ترش، کڑوا
خوش بختی	۔	خوش قسمتی
ناخدا	۔	ملاح
منفرد	۔	انوکھا، جدا
نوازش	۔	کرم، عنایت
خامی	۔	کمی، عیب
استوار	۔	مضبوط
ایوان	۔	محل
ستائش	۔	تعریف
سرشاری	۔	مستی کی کیفیت
تجزیہ	۔	جائزہ لینا
عظمت	۔	بڑائی، بلندی
دانشگاہ	۔	علم حاصل کرنے کی جگہ
طوالت	۔	لمبائی، ضخامت
علالت	۔	بیماری
سعادت	۔	فرماں برداری

آپ نے پڑھا

- راجندر سنگھ بیدی کا شمار اردو کے بلند پایہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے اور ان کا سب سے بڑا کمال ان کے فن کی

صناعی ہے اور وہ انسانی نفسیات کے ماہر اور نباض ہیں۔

- بیدی نے اپنے افسانوں کا مواد متوسط طبقہ سے لیا ہے اور انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو پیش کیا ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. انٹرویو لینے والوں کے نام بتائیے۔
2. کس کا انٹرویو لیا گیا؟
3. راجندر سنگھ بیدی کس شہر میں پیدا ہوئے تھے؟
4. بیدی کے پہلے افسانے کا کیا نام ہے؟
5. بیدی کی موت کب ہوئی تھی؟

مختصر سوالات

1. راجندر سنگھ بیدی کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟
2. بیدی نے کن کن دفاتر میں کام کیے؟
3. بیدی لاہور کے کس محکمہ میں کام کرتے تھے؟
4. عصمت آپا کی شخصیت پر پانچ جملے لکھئے۔
5. بیدی اور کرشن چندر میں پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟

طویل سوالات

1. عصمت چغتائی کے بارے میں دس جملے لکھیے۔
2. راجندر سنگھ بیدی کے افسانوی مجموعوں کے نام لکھئے۔
3. بیدی کی افسانہ نگاری کی خصوصیات پر چند جملے لکھیے۔
4. بہار کے عہد حاضر کے چند ممتاز افسانہ نگاروں کے نام لکھیے۔
5. مندرجہ ذیل لفظوں کی جمع بنا کر لکھیں۔

شخص، ادب، صنف، حقیقت، عنصر، حصہ، کیفیت، تخیل

6. ذیل کے الفاظ کی اضداد لکھیے۔

بلند، حقیقت، وجود، تلخ، لائق، زندگی، خوش بختی، قریب، ممکن، شروع

7. خالی جگہوں کو بھریے: (متن کے حوالے سے)

عصمت آپا...... کریں گی اور میں...... دوں گا۔

میں سمجھتا ہوں...... میں جب...... میں کام کرتے تھے۔

اس...... کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں...... سوالات...... نے کئے ہیں۔

1948ء میں آپ...... بھی رہے ہیں۔

آیئے، کچھ کریں

1. ہندوستان کے چند مشہور افسانہ نگاروں کی تصاویر جمع کر کے اپنے اردو کے استاد کو دکھائیں اور اپنے درجہ میں آویزاں کریں۔
2. راجندر سنگھ بیدی سے جو انٹرویو لیا گیا ہے اس کو آپ نے پڑھا اور سمجھا ہے۔ اب آپ دوست مل کر اپنے کسی استاد کا انٹرویو لیجئے۔ سوالات جو پوچھنا ہے، اسے تیار کریں اور اس میں اپنے اردو کے استاد کی مدد لیں۔
3. راجندر سنگھ بیدی کے انٹرویو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد اب آپ راجندر سنگھ بیدی پر دس سطر کا ایک مضمون لکھیں۔

ABSOL ADIEL SOLUTIONS PATNA

نظم

اردو میں نظموں کا سراغ سرسید تحریک سے پہلے بھی ملتا ہے لیکن یہ ایک سچائی ہے کہ سرسید کی تحریک کے زیر اثر مغرب سے استفادے کا دور شروع ہوا تو نظم نگاری کی روایت میں انقلاب آ گیا۔ محکمہ تعلیم حکومت پنجاب کے قیام کے دوران محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی نے نظم نگاری کی تحریک کی قیادت کی اور نظم نگاروں کی ایک جماعت قائم ہوگئی۔ اور یہیں سے اردو ادب کی تاریخ میں جدید دور کا آغاز ہوا۔ اسی وجہ سے حالی اور آزاد کو جدید نظم کا پیش رو مانا جاتا ہے۔ اس دور میں جدید نظم نگاری کی حیثیت سے جن نظم نگاروں کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ان میں اسماعیل میرٹھی، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی، عبدالحلیم شرر اور اکبر الہ آبادی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان شاعروں میں جدید نظم نگاری کی روایت کو مضبوط اور مستحکم بنانے میں اپنی بھرپور صلاحیتوں کا استعمال کیا۔

بیسویں صدی میں درگا سہائے سرور جہان آبادی، اقبال، چکبست اور نظم طباطبائی جیسے شاعروں نے نظم نگاری کی طرف خصوصی توجہ کی۔ لیکن اقبال نے اس دور میں وہ کارنامہ انجام دیا جس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ اسی وجہ سے اقبال کو بیسویں صدی کا عظیم ترین شاعر مانا جاتا ہے۔ اقبال نے ہیئت اور موضوع دونوں سطحوں پر انقلاب برپا کر دیا۔ اقبال کے بعد ہی نظموں میں عالمانہ اور فلسفیانہ موضوعات کو نظم کے قالب میں ڈھلنے کا موقع مل سکا۔

اقبال کے بعد اردو میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی اور حیات و کائنات کے خارجی اور داخلی مسائل کو موضوع بنا کر نظمیں کہی جانے لگیں۔ اقبال کے زمانے میں ہی جوش نے قومی تحریک سے متاثر ہو کر انقلابی نظمیں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ اختر شیرانی نے رومانی نظموں کی تخلیق پر توجہ کی۔ فراق نے مختصر تعداد میں نظمیں کہیں۔ اس طرح اردو نظموں میں نئی نئی کروٹیں ابھرنے لگیں۔ فلسفیانہ تیور نظر آنے لگے۔ پابند نظموں کے ساتھ ساتھ معریٰ نظمیں اور آزاد نظمیں اس دور میں کافی تعداد میں لکھی گئیں اور اس طرح مقبول ہوئیں کہ پابند نظم نگاری کی روایت کمزور پڑنے لگی۔ اس سلسلے میں فیض، مخدوم، مجاز، علی سردار جعفری، جمیل مظہری، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، وامق جونپوری، سکندر علی وجد وغیرہ ایسے شعرا ہیں جنہوں نے ترقی پسند نظموں کو وقار عطا کیا۔ راشد، میراں جی اور اختر الایمان جدید اردو نظم کی ایسی مثلیث مانے جاتے ہیں جن کے شاعرانہ کمالات سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جدیدیوں نے اردو نظم کو داخلیت اور علامت سے گھلا ملا کر ایک نئی راہ نکالی۔ وزیر آغا، شہریار، افتخار عارف، محمد علوی، ندا فاضلی، قاضی سلیم، باقر مہدی وغیرہ اس گروہ کے نمائندہ شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ شاعرات نے بھی اس دور میں اپنے کمالات کا اظہار کیا۔ ان میں شفیق فاطمہ شعریٰ، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر اسی دور کی پیداوار ہیں۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں دانشورانہ اور فلسفیانہ افکار کے اظہار کے لئے سب سے اچھا اور موثر سانچہ نظم ہے۔

چکبست

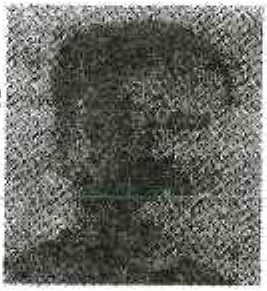

چکبست کا پورا نام پنڈت برج نارائن ہے اور چکبست تخلص ہے۔ ان کی پیدائش 1882ء میں فیض آباد (یوپی) میں ہوئی۔ لیکن چکبست کے آباواجداد چونکہ لکھنو سے تعلق رکھتے تھے اس لئے چکبست بھی بچپن میں ہی لکھنو چلے آئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اویکنگ کالج لکھنو میں داخلہ لیا۔ 1905ء میں بی اے پاس اور 1908ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور عملاً وکالت بھی شروع کردی۔ رفتہ رفتہ چکبست لکھنو کے مشہور وکیلوں میں شمار ہونے لگے۔ 1926ء میں ایک مقدمہ کے سلسلے میں چکبست رائے بریلی تشریف لے گئے اور وہاں کی عدالت میں کامیابی کے ساتھ بحث کی اور اسی دن سہ پہر کو لکھنو جانے کے لئے اسٹیشن آئے ٹرین میں بیٹھے ہی تھے کہ دماغ پر فالج کا حملہ ہوا اور زبان بند ہوگئی۔ علاج و معالجہ کیا گیا لیکن سب بے سود ثابت ہوا۔ وقت موعود آچکا تھا۔ 7 ربجے شام کو اسٹیشن پر ہی چکبست کا انتقال ہوگیا لاش کو لکھنو لایا گیا اور آخری رسوم ادا کردی گئی۔

چکبست فطری شاعر تھے چنانچہ ان کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا یہی وجہ ہے کہ 9-10 سال کی عمر میں چکبست نے پہلی غزل کہی۔ تب سے انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور زندگی کی آخری سانسوں تک شعرگوئی میں مصروف رہے۔ اساتذہ شعرا میں چکبست آتش، غالب اور انیس کے شیدائی تھے۔ ان کی غزلوں میں آتش کا رنگ اور مسدس پر انیس کی تقلید کا اثر نمایاں ہے۔ شاعری کے خیالات گرچہ اساتذہ کے خیال سے مختلف ہیں لیکن طرز کلام سلاست زبان، بندش الفاظ اور حسن تراکیب میں مذکورہ اساتذہ کی تقلید نمایاں ہے۔

چکبست نے اپنی شاعری میں نئے نئے خیالات نظم کیے مگر زبان کی چاشنی، اسلوب بیان، لطافت اور پاکیزگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ کیونکہ الفاظ کی بندش سے صناعی کرنا ہی دراصل شاعری کا جز واعظم ہے۔ جیسا کہ آتش نے کہا ہے۔

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

مناظرِ قدرت

فضائے کوہ میں ایسی ہوا سماتی ہے
بشر کی روح کو راحت کی نیند آتی ہے

بس ایک عالم ہو چار سمت طاری ہے
نہ شور و شر ہے نہ دنیا کی آہ و زاری ہے

اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمہ دل گیر
شجر حجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر

یہ راگ وہ ہے جو مضراب کا اسیر نہیں
یہ حرف کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں

وہی سنے گا اسے دل گداز ہے جس کا
ہو دل میں سوز تو رگ رگ میں ساز ہے اس کا

حریم خاص میں قدرت کے باریابی تھی
نگاہِ شوق میں اک شان بے حجابی تھی

شریک جاں تھی وضع قدیم قدرت کی
عیاں تھی سنگ و شجر سے کشش محبت کی

شراب اس حقیقی سے تھا ہر اک سرشار
شجر تھا کوہ تھا چشمہ تھا یا یہ مشتِ غبار

درخت و کوہ ہیں کیا ذات پاک انساں کیا
طیور کیا ہیں ہوا کیا ہے ابرباراں کیا

یہ موج ہستی بیدار کے عناصر ہیں
سب ایک قافلۂ شوق کے مسافر ہیں

یہ دل کے ٹکڑے ہیں قدرت کے ان میں بیر نہیں
سب ایک گود کے پالے ہیں کوئی غیر نہیں

انہیں سے نغمۂ قدرت ہے اوج و پستی میں
سب ایک ساز کے پردے ہیں بزم ہستی میں

جدا کسی سے بھی ہستی کا اپنے راز نہیں
کچھ آبشار میں اور ہم میں امتیاز نہیں

ہے جسم خاک یہاں اس کا جسم پانی ہے
جو روح ہم میں ہے اس میں وہی روانی ہے

لفظ و معنی

کوہ	-	پہاڑ
بشر	-	انسان
عالم ہو	-	سناٹا، ویرانی
طاری ہے	-	چھایا ہوا ہے
آہ وزاری	-	رونا وگڑگڑانا
نغمہ	-	گانا
شجر	-	درخت
حجر	-	پتھر
مضراب	-	موسیقی کا ایک آلہ
اسیر	-	قیدی
گوشہ گیر	-	گوشہ پکڑنے والا
دل گداز	-	پگھلنے والا دل، نرم دل
سوز	-	جلن
مے	-	شراب
باریابی	-	دربار میں آنے کی اجازت
بے حجابی	-	بے پردگی
سنگ	-	پتھر
آب خنک	-	ٹھنڈا پانی
وضع قدیم	-	پرانا طریقہ
عیاں	-	ظاہر
انس	-	پیار، الفت
سرشار	-	بھرا ہوا، لبریز

ABSOL SOLUTIONS PATNA

طیور	-	پرندے، طائر کی جمع
ابر	-	بادل
باراں	-	بارش
بیر	-	اختلاف، جھگڑا
بزمِ ہستی	-	دنیا کی محفل

آپ نے پڑھا

- زیرِ نصاب نظم 'مناظرِ قدرت' پنڈت برج نارائن چکبست کی تخلیق ہے جو ان کی منظری شاعری کی بہترین مثال ہے۔ اس نظم میں چکبست نے نہ صرف یہ کہ اپنے ملک ہندوستان کے فطری مناظر کو حسن و جمال کی تعریف کی ہے بلکہ بالواسطہ طور پر ہندوستان کی عظمت دیرینہ کے گیت بھی گائے ہیں۔
- اس نظم کا ایک خاص پس منظر بھی ہے۔ شاعر چکبست نے ایک بار دہرہ دون کا سفر کیا تھا۔ دہرہ دون صوبہ اترانچل کا صدر مقام ہے اور قدیم زمانے سے ہی خوبصورت پہاڑی علاقے میں شمار کیا جاتا ہے۔ دور دور کے علاقوں اور غیر ممالک سیاح وہاں کے خوبصورت فطری مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے آتے ہیں۔ شاعر نے دہرہ دون کے سفر میں اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا اور جو کچھ محسوس کیا اسے شعری قالب میں ڈھال دیا ہے۔
- دہرہ دون ایک پہاڑی مقام ہے جہاں پہاڑ کی بلندی اور وہاں کی خاموشی قابلِ دید ہے اگر دل نکتہ شناس ہو تو اس ویرانے اور بلندی پر خدا کی قدرت اور اس کے وجود کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دہرہ دون کے پہاڑوں کی خاموشی اپنی زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ اگر چشم بینا ہو اور دل حساس ہو تو اس ویرانے اور خاموشی میں بھی قدرت کے نظاروں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. چکبست کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟
2. چکبست نے کون کون سی ڈگریاں حاصل کی؟
3. چکبست کا انتقال کس بیماری میں ہوا؟
4. چکبست کی کون سی نظم ہمارے نصاب میں شامل ہے؟

5. چکبست کا پورا کیا نام کیا تھا؟

مختصر سوالات

1. چکبست کے بارے میں پانچ جملے لکھیے۔
2. جدید اردو نظم کی مختصر تعریف کیجیے۔
3. زیر نصاب نظم میں شاعر نے کہاں کی منظر نگاری کی ہے؟
4. نظم کے اجزائے ترکیبی پر روشنی ڈالیے۔

طویل سوالات

1. چکبست کی نظم نگاری کا فنی جائزہ لیجیے۔
2. جدید نظم کی تعریف کرتے ہوئے اس کا ارتقائی جائزہ لیجیے۔
3. زیر نصاب نظم 'مناظر قدرت' کا مرکزی خیال پیش کیجیے۔
4. صحیح مصرعوں کا جوڑ لگایئے:

(الف) فضائے کوہ میں ایسی ہوا سماتی ہے	(i) یہ حرف کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں
(ب) یہ راگ ہے وہ جو مضراب کا اسیر نہیں	(ii) نہ شور و شر ہے نہ دنیا کی آہ وزاری ہے
(ج) جدا کسی سے بھی ہستی کا اپنے راز نہیں	(iii) بشر کی روح کو راحت کی نیند آتی ہے
(د) بس ایک عالم ہو چار سمت طاری ہے	(iv) کچھ آبشار میں اور ہم میں امتیاز نہیں

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے جدید نظم نگار شعرا کی فہرست تیار کیجیے۔
2. طلبہ کی مدد سے جدید شعرا کی موجودگی کو یقینی بنا کر ایک مشاعرہ کا اہتمام کیجیے۔

جگن ناتھ آزاد

جگن ناتھ آزاد محقق بھی تھے اور شاعر بھی۔ اور ان دونوں حیثیتوں سے ان کی اہمیت مسلم مانی جاتی ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے وہ غزل گوئی اور نظم نگاری پر بھی یکساں دسترس رکھتے تھے۔ ان کے والد تلوک چند محروم بھی شاعر تھے۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ شاعری انہیں وراثت میں ملی تھی۔

جگن ناتھ آزاد 5 دسمبر 1918ء کو عیسیٰ خیل میں پیدا ہوئے جو اب پاکستان کے ضلع میانوالی کی تحصیل ہے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے گھر ہی پر اپنے والد سے حاصل کی جو ایک اسکول ٹیچر بھی تھے۔ پہلے کلور کوٹ کے ایک اسکول میں ان کا داخلہ تیسرے درجے میں ہوا۔ 12 برس کی عمر میں انہوں نے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ان کا داخلہ موہن رائے ہندو ہائی اسکول، میانوالی میں ہوا۔ جہاں سے انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ جب والد کا تبادلہ راولپنڈی ہوگیا تو وہاں کے ڈی اے وی کالج میں داخلہ لیا۔ 1933ء میں ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ پھر گارڈن کالج، راولپنڈی سے بی اے کیا۔ 1942ء میں انہوں نے پنجاب یونی ورسٹی سے فارسی زبان وادب میں آنرز کی ڈگری حاصل کی اور اسی مضمون میں 1944ء میں ایم اے کیا۔

جب ملک کا بٹوارہ ہوا تو وہ ستمبر 1947ء میں دہلی آگئے۔ لیکن پاکستان سے ان کا تعلق ہمیشہ قائم رہا۔

جگن ناتھ آزاد نے مختلف قسم کی نوکریاں کیں اور آخر میں جموں یونی ورسٹی میں انہیں صدر شعبہ اردو کا عہدہ ملا۔ وہ اس منصب پر 1983ء تک رہے۔ پھر پروفیسر امریٹس بنادیئے گئے۔ یہ اعزاز ان کے لئے تاحیات تھا۔

محقق کی حیثیت سے انہوں نے بہت اہم خدمات انجام دیں ان کا شمار ماہرین اقبالیات میں ہوتا ہے۔

شاعری میں انہوں نے غزل کے ساتھ ساتھ نظموں میں بھی اپنی ایک خاص پہچان بنائی۔ وہ ترقی پسند دور کے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی غزلوں اور نظموں میں کلاسیکی اور روایتی رنگ کو پھیکا نہیں پڑنے دیا۔

25/ جولائی 2004ء کو ان کا انتقال دہلی میں ہوا۔

انڈیا گیٹ

انڈیا گیٹ کی رفعت ہے نگاہوں پہ محیط
انڈیا گیٹ وہ تاریخ کا اک بابِ جلیل
انڈیا گیٹ وہ افرنگ کی تعمیرِ جمیل
انڈیا گیٹ وہ اغیار کی نصرت کا نشاں
انڈیا گیٹ وہ اپنوں کی غلامی کی دلیل

کشورِ ہند کے جانباز محبانِ وطن
خون سے سینچے نکلے ہیں پیرایوں کا چمن
ایک سیلاب شجاعت کا بڑھا آتا ہے
کہیں دجلے کی ہیں لہریں کہیں امواج جمن

واہ کیا جوش تہوّر کا ہے اشد غنی
ہر قدم سے ہے عیاں حسرتِ شمشیر زنی
بھوک ہر شخص کو جانباز بنا دیتی ہے
اور افلاس رہِ منزلِ حب الوطنی

سامنے دیدۂ مشتاق کے موجود ہے کیا
زندگانی کے خزانے سے یہ مفقود ہے کیا
اوج افلاک تری منزلِ مقصود ہے کیا
انڈیا گیٹ کی رفعت ہے نگاہوں پہ محیط

لفظ و معنی

رفعت	۔	بلندی
محیط	۔	پھیلا ہوا
تعمیر	۔	بناوٹ
جمیل	۔	خوبصورت
اغیار	۔	غیر کی جمع
نصرت	۔	کامیابی
کشورِ ہند	۔	ملک ہندوستان کی طرف اشارہ ہے
جانباز	۔	بہادر، جان دینے والا
محبان	۔	دوست، محب کی جمع
شجاعت	۔	بہادری
غنی	۔	بے نیاز
عیاں	۔	ظاہر
افلاس	۔	غریبی
دشت	۔	جنگل
علم	۔	جھنڈا
مشتاق	۔	چاہت، چاہنے والا
مفقود	۔	گم شدہ چیزیں، نایاب

اوج - بلندی

اخلاص - خلوص کی جمع

مطیع - فرماں بردار

آپ نے پڑھا

- اس نظم میں شاعر نے انڈیا گیٹ کی عظمت کا ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ گیٹ ہندوستان کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے اگرچہ اس کی تعمیر انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں کی تھی لیکن اس کے باوجود اس سے ہندوستان کی عظمت کی پہچان نمایاں ہوتی ہے۔
- شاعر کو یہ احساس بار بار ستاتا ہے کہ ہم اپنی عظمت کی پہچان کے لئے دوسروں کے دست نگر ہیں۔ آزادی کی طلب اور ہندوستان کی اپنی پہچان ہمارا سب سے بڑا مقصد ہونا چاہئے۔ ہر طرف افلاس اور ناداری کا نقشہ نظر آتا ہے۔ لیکن ہم فرنگیوں کی تعمیر کردہ نشانی پر فخر کرنے لگتے ہیں۔
- ہمیں اپنی صحیح منزل کو سمجھنا چاہئے اور انڈیا گیٹ کو تاریخ کی ایک یادگار کے طور پر قبول تو کرنا چاہئے لیکن ہمیں اپنے بنیادی مسائل کی طرف بھی توجہ دینی چاہئے۔ نظم میں مختصر لیکن پر اثر انداز میں شاعر نے قومی حمیت کو للکارا ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. جگن ناتھ آزاد کب پیدا ہوئے؟
2. جگن ناتھ آزاد کے والد کا نام کیا ہے؟
3. انڈیا گیٹ کہاں ہے؟
4. انڈیا گیٹ کی تعمیر کس نے کی؟

مختصر سوالات

1. اس نظم میں شاعر نے جو کچھ کہا ہے اسے پانچ جملے میں لکھئے۔
2. نظم کی مختصر تعریف کیجئے۔
3. جگن ناتھ آزاد کے تین شعری مجموعوں کے نام لکھئے۔

4. جگن ناتھ آزاد کے مختصر حالات پانچ جملے میں لکھیے۔

5. اسم ضمیر کی تعریف لکھیے۔

طویل سوالات

1. نظم کے پہلے بند کی تشریح کیجیے۔

2. زیر نصاب نظم 'انڈیا گیٹ' کا خلاصہ پیش کیجیے۔

3. جگن ناتھ آزاد کی نظم نگاری کا جائزہ لیجیے۔

4. واحد سے جمع بنائیے۔

غیر، باب، دلیل، شخص، مقصد

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے پانچ مسلم شعرا کے نام لکھیے۔

پرویز شاہدی

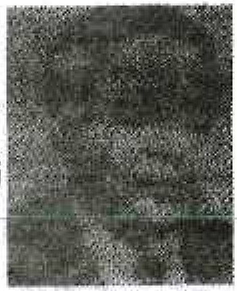

پرویز شاہدی کا پورا نام سید اکرام حسین تھا۔ اردو شاعری میں پرویز شاہدی کے نام سے مشہور ہوئے۔ والد کا نام سید احمد حسین تھا۔ پرویز شاہدی کے خاندانی پس منظر کے بارے میں ایک ناقد سالک لکھنوی لکھتے ہیں:

> '30 ستمبر 1910ء کو لودی کٹرہ، پٹنہ سیٹی کی عالم منزل میں ایک نجیب الطرفین سید احمد حسین کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے جس کا نام سید اکرام حسین رکھا جاتا ہے۔ سید احمد حسین بہار کے ایک زمیندار، ایک اچھے شاعر اور صاحب نظر ادیب اور عظیم آباد کی روایتی تہذیب کے علم بردار تھے۔ صوفی منش ہوتے ہوئے بھی گھر کی فضا میں راست و مذہبیت کا رنگ غالب تھا جو رواداری، وضع داری اور صاف ستھری قدیم تہذیب کا غماز تھا۔'

پرویز شاہدی کے آباو اجداد میں ایک سید محمد جنگ تھے جو سلطان محمد غوری کی فوج میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ سید محمود جنگ کی شادی راجگیر کے میر احمد علی کی دختر سے ہوئی جن سے سید حامد حسین پیدا ہوئے۔ حامد حسین کی نسل میں سید احمد حسین تھے جو پرویز شاہدی کے والد تھے۔ اس طرح پرویز شاہدی کا خاندانی پس منظر اعلیٰ و ارفع تھا۔ پرویز کی تعلیم و تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی اور انہوں نے مدرسہ نظامیہ میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔ صوفیانہ ماحول کی وجہ سے غالب گمان یہ ہے کہ پرویز نے کسی بزرگ سے بیعت بھی کر لی تھی۔

پرویز نے 1925ء میں کولکاتہ یونی ورسٹی سے میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد وہ پٹنہ چلے آئے اور پٹنہ یونی ورسٹی سے 1930ء میں آنرس کیا۔ 1934ء میں اردو میں ایم اے کیا اور 1935ء میں فارسی میں ایم اے کیا۔ اسی سال کولکاتہ واپس لوٹ گئے اور اسلامیہ اسکول میں مدرس ہوئے۔ پھر چند دنوں کے لئے انسپکٹر آف اسکول بھی ہوئے آخر کار 1947ء میں

سریندر ناتھ کالج کولکاتہ میں اردو کے لکچرر بحال ہوئے۔ اسی زمانے میں پرویز کے سیاسی شعور میں انقلابی تبدیلی آئی اور انہوں نے مارکسی نظام کا مطالعہ کیا جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں اشتراکیت کا رنگ آ گیا۔

1958ء میں پرویز شاہدی شعبہ اردو کولکاتہ یونی ورسٹی سے وابستہ ہوگئے۔ قیام کولکاتہ کے دوران ہی پرویز کی شادی اعلیٰ تعلیم یافتہ فضیلت النساء بیگم سے ہوئی۔

پرویز شاہدی کو شعر و ادب کا ذوق خداداد تھا۔ انہوں نے پہلا شعر آٹھ سال کی عمر میں کہا شروع میں اکرام تخلص رکھا پھر پرویز تخلص کرنے لگے۔ شاہدی کی نسبت ننہیال سے ہے جو ان کے پرنانا سید شاہ شاہد حسین سے منسوب ہے۔

مرض تنفس اور کثرت نوشی کی وجہ سے 5 مئی 1968ء کو پرویز شاہدی کا انتقال ہو گیا۔

پرویز شاہدی نے شاعری کی ابتدا میں ناسخ کا رنگ اپنایا پھر غالب کی پیچیدگی کی طرف مائل ہوئے۔ ان کے چند اشعار میں جگر مرادآبادی کا رنگ بھی ملتا ہے۔ اس تقلیدی دور میں پرویز شاہدی اقبال اور جوش کے ساتھ بنگلہ کے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور اور قاضی نذرالاسلام سے بھی متاثر ہوئے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود پرویز خود فطرت کی طرف سے اعلیٰ دل و دماغ لے کر آئے تھے۔ لہذا انہوں نے شاعری میں اپنا راستہ خود بنایا اور جلد ہی اپنا انفرادی رنگ قائم کرلیا۔ پرویز شاہدی کے دو شعری مجموعے 'رقص حیات' اور 'تثلیث حیات' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

ہم نوجواں ہیں

ہم نوجواں ہیں، جانِ بہاراں، مرگِ خزاں ہیں
شادابیوں کا گلشن بداماں، اک کارواں ہیں
جام و سبو کی، کیف و نمو، روح تپاں ہیں
ہم آتشِ گل کی رقص کرتی چنگاریاں ہیں
ہم نوجواں ہیں!

وہ ہوں دفاتر، یا درسگاہیں یا کارخانے
جذبات کے یا افکار کے ہوں وہ آشیانے
سبزے کی مسند، کالے دھوئیں کے شامیانے
سن کر صدائیں سازِ جوانی سب نغمہ خواں ہیں
ہم نوجواں ہیں!

بھیگی حسیں پھر کیف نمو کا حق مانگتی ہے
تسکین ذوق جام و سبو کا حق مانگتی ہے
بزمِ جوانی میں ہائے ہو کا حق مانگتی ہے
بارود مل کر کس کو ڈراتی یہ جھریاں ہیں
ہم نوجواں ہیں!

شعلے غضب کے رہتے ہیں رقصاں قلب وجگر میں

سانسیں ہماری سورج کی کرنیں شوق سحر میں
سوراخ کردیں ظلمت کدوں کے دیوار و در میں

سوز دروں سے اپنی نگاہیں آتش فشاں ہیں
ہم نوجواں ہیں!

باغ نشاط حسن و محبت لے کر رہیں گے
صبح تبسم، شام مسرت لے کر آئیں گے
جو چھن گئی ہے وہ اپنی جنت لے کر رہیں گے

بے کار بر ہم بوڑھے جہنم کے پاسباں ہیں
ہم نوجواں ہیں!

لفظ و معنی

مرگ - موت
خزاں - پت جھڑ
گلشن بداماں - دامن میں گلشن لئے ہوئے
کاروان - جماعت
جام و سبو - جگ اور گھڑا
روح تپاں - گرمی سے تپتی ہوئی روح
آتش - آگ
رقص - ناچ
غضب - بہت زیادہ غصہ
قلب و جگر - دل و جگر

سحر	۔	صبح
ظلمت	۔	تاریکی، اندھیرا
در	۔	دروازہ
سوزدروں	۔	اندرونی جلن
آتش فشاں	۔	آگ اگلتی ہوئی
شرارہ	۔	آگ کا شعلہ
خورشید	۔	سورج
سیال	۔	بہتی ہوئی چیز
آہن	۔	لوہا
افکار	۔	سوچ (فکر کی جمع)
صدا	۔	آواز
نغمہ خواں	۔	گانا گانے والے
بزم	۔	محفل
نشاط	۔	خوشی
مسرت	۔	خوشی
تبسم	۔	مسکراہٹ
برہم	۔	ناراض
پاسباں	۔	حفاظت کرنے والا

ABDEL SOLUTIONS ABSOL PATNA

آپ نے پڑھا

- پرویز شاہدی کی زیر نصاب نظم 'ہم نوجوان ہیں' تکنیک کے لحاظ سے ایک جدید نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر نے موجودہ عہد کے نوجوانوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔
- شباب کے زمانے میں نوجوانوں کے دل میں کیا کیا جذبات ابھرتے ہیں اور وہ معاشرے سے کیا چاہتا ہے ان تمام اندرونی کیفیات کو شاعر نے نہایت سلیقے کے ساتھ اس نظم میں سمونے کی کوشش کی ہے۔

- جس طرح بچے اپنے پسندیدہ چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے ضد کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جوانی کے جوش و جذبات میں انسان اس قدر بہنے لگتا ہے کہ ہر پسندیدہ چیز کو وہ بہر نوع حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
- یہ نظم شاعر پرویز شاہدی نے کلکتہ میں نوجوانوں کے ایک اجلاس میں پڑھا تھا۔ جس میں نوجوانوں کی معتد بہ تعداد موجود تھی۔ چنانچہ نوجوانوں کی کثرت کو دیکھ کر شاعر نے اس نظم میں نوجوانوں کے جذبات کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. پرویز شاہدی کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟
2. کتنے سال کی عمر میں پرویز شاہدی کے والدین اس دار فانی سے رخصت ہو گئے؟
3. پرویز شاہدی کی اہلیہ کا نام کیا تھا؟
4. پرویز شاہدی کے کسی دو شعری مجموعے کا نام لکھئے۔
5. تثلیث حیات کی اشاعت کب ہوئی؟

مختصر سوالات

1. پرویز شاہدی کی تصنیفات پر مختصر روشنی ڈالئے۔
2. پرویز شاہدی کی شاعری پر پانچ جملے لکھئے۔
3. زیر نصاب نظم 'ہم نوجوان ہیں' کے پہلے بند کی تشریح کیجئے۔
4. جدید نظم کے بارے میں مختصراً لکھئے۔
5. مخمس نظم کسے کہتے ہیں؟

طویل سوالات

1. پرویز شاہدی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔
2. زیر نصاب نظم 'ہم نوجوان ہیں' کا مرکزی خیال پیش کیجئے۔

1. جدید نظم کی ارتقائی تاریخ بیان کیجئے۔
2. خالی جگہوں کو بھر کر مصرعہ مکمل کیجئے:

بھیگی...... پھر کیف نمو...... مانگتی ہے

آیئے، کچھ کریں

1. پرویز شاہدی کے شعری مجموعوں سے دس منتخب نظموں کی فہرست بنایئے۔
2. بہار کے اردو شعرا کے درمیان پرویز شاہدی کا مقام متعین کیجیے۔

ندا فاضلی

ندا فاضلی جدید دور کے مشہور شاعر ہیں۔ وہ گوالیار میں پیدا ہوئے۔ 1964-65 میں ان کے والد، والدہ اور بہنیں کراچی (پاکستان) میں جا بسے۔ ندا فاضلی طالب علمی کے دور سے گزر رہے تھے، اس لئے انہوں نے ہندوستان ہی میں رہنا پسند کیا۔ انہوں نے اردو اور ہندی مضامین میں ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد وہ بمبئی آگئے اور یہیں کے ہو رہے۔ پہلے تو انہوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور اردو ہندی کے مختلف رسالوں سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد وہ نغمہ نگار اور مکالمہ نگار کی حیثیت سے فلمی صنعت سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن ادب سے ان کا سروکار قائم رہا۔

ندا فاضلی نے غزلیں اور نظمیں بھی کہی ہیں اور دوہے بھی لکھے ہیں گویا ہر صنف میں انہوں نے شہرت حاصل کی۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے کمزور اور پس ماندہ طبقے کے مسائل کو اپنی تخلیقات میں ابھارا ہے۔ مختلف مذاہب اور عقیدوں کے تلمیحاتی اشاروں کو لفظوں میں پرو کر انہوں نے اپنی تخلیقی ذہانت کا ثبوت دیا ہے اور اپنے فنی تجربے کو انسانی زندگی کے عام تجربوں سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ لفظوں کا پل، مور ناچ، آنکھ اور خواب کے درمیاں، کھویا ہوا سا کچھ، شہر میرے ساتھ چل، زندگی کی ترپ ان کے شعری مجموعے ہیں۔

ندا فاضلی نے شاعری کے ساتھ نثر میں بھی تخلیقی اور تنقیدی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ان میں ملاقاتیں (تنقید)، دیواروں کے باہر (سوانحی ناول)، دیواروں کے بیچ (سوانحی ناول)، چہرے (خاکے)، دنیا مرے آگے (خاکا) وغیرہ شامل ہیں۔ سوانحی ناول اور خاکے ان کی قابلِ قدر تصنیفات میں شمار کیے جاتے ہیں۔

انہوں نے مغرب و مشرق کے کئی ممالک یو ایس اے، یو اے ای، جرمنی، بنگلہ دیش، پاکستان، انگلینڈ اور ماریشش وغیرہ میں ہندوستانی ادیبوں کی نمائندگی بھی کی ہے۔

ندا فاضلی کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، شکھر سمان، غالب ایوارڈ اور خسرو ایوارڈ جیسے اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔

ندا فاضلی بقیدِ حیات ہیں اور ان کا ادبی سفر جاری ہے۔

بجلی کا کھمبا

کئی سال گذرے
اسی رہگذر پر
کسی پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں تلے میں
اندھیروں میں گم سم سا بیٹھا ہوا تھا

کئی اجنبی راہ گیروں نے مجھ کو
مرا نام لے لے کے آواز دی تھی
فضاؤں میں ہلچل سی ہونے لگی تھی
مگر دوست!
یہ بات ہے ان دنوں کی
یہاں —
کوئی بجلی کا کھمبا نہیں تھا
مگر چاند کا نور میلا نہیں تھا

نظم بہت آسان تھی پہلے

نظم بہت آسان تھی پہلے
گھر کے آگے
پیپل کی شاخوں سے اچھل کے
آتے جاتے
بچوں کے بستوں سے نکل کے
رنگ بہ رنگی
چڑیوں کی چہکاریوں میں ڈھل کے
جب میرے گھر میں آتی تھی
میرے قلم سے جلدی جلدی
خود کو پورا لکھ جاتی تھی
اب سب منظر بدل چکے ہیں
چھوٹے چھوٹے چوراہوں سے
چوڑے رستے نکل چکے ہیں
بڑے بڑے بازار
پرانے گلی محلے نگل چکے ہیں
نظم سے مجھ تک
اب میلوں لمبی دوری ہے

ان میلوں لمبی دوری میں
کہیں اچانک، بم پھٹتے ہیں
کوکھ میں ماؤں کے سوتے بچے کٹتے ہیں
مذہب اور سیاست مل کر
نئے نئے نعرے رٹتے ہیں
بہت سے شہروں
بہت سے ملکوں سے اب ہو کر
نظم میرے گھر جب آتی ہے
اتنی زیادہ تھک جاتی ہے
میرے لکھنے کی ٹیبل پر
خالی کاغذ کو خالی ہی چھوڑ کے رخصت ہو جاتی ہے
اور کسی فٹ پاتھ پہ جا کر
شہر کے سب سے بوڑھے شہری کی پلکوں پر
آنسو بن کر سو جاتی ہے

لفظ و معنی

رہگذر	۔	راستہ
اجنبی	۔	انجان، پردیسی
راہ گیر	۔	راستہ چلنے والا، مسافر
گم سم	۔	خاموش، کھویا کھویا سا
فضا	۔	ماحول
نور	۔	روشنی

شاخوں	-	ڈالیاں
بستہ	-	تھیلا
رنگ بہ رنگی	-	طرح طرح کے رنگ
منظر	-	سماں
کوکھ	-	پیٹ
رخصت ہونا	-	الگ ہونا
چہکار	-	چڑیوں کی آواز
چوراہا	-	ایسا چوک جہاں سے چہار جانب راستہ نکلتا ہو
میل	-	لگ بھگ ڈیڑھ کیلومیٹر

آپ نے پڑھا

- جدید اردو نظم نگار شعراء میں جن لوگوں نے اعتبار حاصل کیا ہے اور اردو نظم پر اپنی چھاپ چھوڑی ہے، ان میں ایک ندا فاضلی بھی ہیں۔ جنھوں نے پابند نظمیں بھی لکھی ہیں اور آزاد و معریٰ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ یعنی شعری روایات سے انحراف نہیں کیا ہے اور جدید بدلتے ہوئے تقاضوں کو نظر انداز بھی نہیں کیا ہے۔
- زیر نصاب پہلی نظم 'بجلی کا کھمبا' ندا فاضلی کی ایک آزاد نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر نے سائنسی ایجادات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس حقیقت کی نقاب کشائی کی ہے کہ سائنسی ایجادات و ترقیوں کے نتیجہ میں معاشرے میں جو خرابیاں آئی ہیں ان میں بداخلاقی بھی ہے ان خامیوں کے تعلق سے شاعر نے بداخلاقی اور افراتفری کی طرف اشاروں میں لوگوں کو متوجہ کیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک اخلاقی نظم ہے۔
- دوسری نظم میں شاعر نے صنفِ نظم کے فنی عروج و زوال کو بیان کیا ہے۔ اشاراتی زبان استعمال کرتے ہوئے شاعر نے کہا ہے کہ ابتدا میں نظم کہنا نسبتاً زیادہ آسان تھا۔ ادب اپنے عہد کا آئینہ دار ہوتا ہے اور شاعری ادب کے اس آفاقی اصول سے اچھوتی نہیں ہے اسی لئے بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور مذہبی شدت پسندی نے نظم کے آہنگ کو بھی رفتہ رفتہ بدل دیا ہے۔ آج کے بدلتے ہوئے معاشرتی قدروں اور سیاسی بے اصولی سے نظم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ کیت کے لحاظ سے تو اردو شاعری میں نظموں کا اچھا خاصا سرمایہ موجود ہے اور عالمی سطح پر اسے مقبولیت بھی حاصل ہے لیکن فکر و خیال کے لحاظ سے صنف نظم دھیرے دھیرے کھوکھلی ہوتی جارہی ہے اور شاعری کی

زبان میں نظم پر ضعف و اضمحلال کی کیفیت طاری ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. ندا فاضلی کہاں پیدا ہوئے؟
2. ندا فاضلی کو کون کون سے ایوارڈس ملے؟
3. ندا فاضلی نے مشرق و مغرب کے کن ملکوں میں ہندوستانی ادیبوں کی نمائندگی کی؟
4. ندا فاضلی کے تین شعری مجموعوں کے نام لکھیے۔
5. ندا فاضلی نے سماج کے کس طبقے کے مسائل کو اپنی نظموں میں ابھارا ہے؟

مختصر سوالات

1. ندا فاضلی کی شاعری کے بارے میں پانچ جملے لکھیے۔
2. نظم 'بجلی کا کھمبا' کا خلاصہ اپنی زبان میں لکھیے۔
3. کوئی بجلی کا کھمبا نہیں تھا
   مگر چاند کا نور میلا نہیں تھا
   ان مصرعوں کی تشریح کیجیے۔

طویل سوالات

1. ندا فاضلی کن کن حیثیتوں سے فلمی صنعت سے وابستہ رہے؟
2. ندا فاضلی نے شاعری کی کس کس صنف میں طبع آزمائی کی ہے؟
3. ندا فاضلی کی شہرت و مقبولیت کی اصل وجہ پر روشنی ڈالیے۔
4. زیر نصاب نظم 'نظم بہت آسان تھی پہلے' کا مرکزی خیال تحریر کیجیے۔

آئیے، کچھ کریں

1. ندا فاضلی کے شعری اور نثری تخلیقات کی فہرست تیار کیجیے۔
2. اپنے استاد کی مدد سے جدید اردو نظم نگاروں کی ایک فہرست تیار کیجیے۔

سید محمد جعفری

اصل نام سید محمد جعفری ہے۔ اس نام سے مشہور بھی ہیں۔ 1905ء میں پیدا ہوئے۔ جائے پیدائش لاہور ہے۔ والد کا نام سید محمد علی جعفری تھا۔

سید محمد جعفری کی تعلیم و تربیت پھوپھی زاد بھائی سید محمد عبداللہ رضوی کے زیر سایہ ہوئی۔ یہ خود ہی شعبہ تعلیم و تدریس سے وابستہ تھے۔ ان کا شمار بھی اپنے وقت کے اعلیٰ تعلیم یافتہ صاحب کردار اساتذہ میں تھا۔

جعفری نے ابتدا میں عربی، فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ 1922ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ پھر ریاضی، کیمیا اور طبیعات کا ہندی مضامین کے ساتھ بی ایس سی آنرز کی ڈگری لی۔ اس کے بعد آرٹس کی طرف متوجہ ہوئے اور فارسی میں ایم اے کرنے کے بعد انگریزی ادبیات میں ایم اے کی سند لی۔

سید محمد جعفری کو تصویر کشی، خطاطی اور مصوری سے بھی دل چسپی تھی۔ انہوں نے اس فن میں بھی مہارت حاصل کی۔ کالج آف آرٹس میں داخلہ لیا اور عبدالرحمٰن چغتائی اور فیروزالدین جیسے ماہرین فن سے کسب ہنر کیا۔

محکمہ اطلاعات کے اہم منصب پر فائز رہے۔ محکمہ کی طرف سے تہران بھی گئے۔ 1966ء میں سبکدوش ہوئے۔ 7/جنوری 1976ء کو سید محمد جعفری کا انتقال ہوا۔

'شوخی تحریر' سید محمد جعفری کی مزاحیہ شاعری کا مجموعہ ہے۔ جعفری کی زبان میں چٹخی اور چاشنی بھی۔ عروض و وزن اور الفاظ و تراکیب پر بھی پورے اترتے ہیں۔

کھڑا ڈنر

کھڑا ڈنر ہے غریب الدیار کھاتے ہیں   سنے ہوئے شتر بے مہار کھاتے ہیں
اور اپنی میز پہ ہوکر سوار کھاتے ہیں   کچھ ایسی شان سے جیسے ادھار کھاتے ہیں

شکم غریب کی یوں فرسٹ ایڈ ہوتی ہے
ڈنر کے سائے میں فوجی پریڈ ہوتی ہے

کھڑے ہیں میز کنارے جو ایک پلیٹ لیے   انہی نے کوفتے اپنے لیے لپیٹ لیے
اِدھر اُدھر کے جو کھانے تھے سب سمیٹ لیے   کھڑا تھا پیچھے سو میں رہ گیا پلیٹ لیے

یہ میز ہوگئی خالی اب اور کیا ہوگا
'پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا'

تھی ایک مرغ کی ٹانگ اور رقیب لے بھاگا   مرا نصیب بھی جاگا پہ دیر میں جاگا
کباب اٹھایا تو اس میں لپٹ گیا دھاگا   ڈنر یہ کیا کہ نہ پہنچا ہے جس کا نے آگا

یہ کیا خبر تھی میں آیا تھا جب ڈنر کھانے
'حقیقتوں کو سنبھالے ہوئے ہوئے ہیں افسانے'

حقیقتوں کا نہ کہنا زمانہ سازی ہے   یہ شخص دیکھنے میں بڑا نمازی ہے
یہی اڑائے گا مرغی جو موٹی تازی ہے   ڈنر یہ کیا ہے یہ گھوڑ دوڑ کی سی بازی ہے

لگائی بھوک میں مہمیز جس نے پار ہوا
نہیں تو میری طرح سے ڈنر میں خوار ہوا

وہ ایک میز خواتین گرد صف آرا   لبوں سے ان کے رواں گفتگو کا فوارہ
میں ایک گوشے میں سہما کھڑا ہوں بیچارہ   کہ یہ ہٹیں تو اٹھاؤں میں نان کا پارہ

اسیرِ حلقۂ خوباں جو مرغ و ماہی ہیں
تو ہم شہیدِ ستم ہائے کم نگاہی ہیں

SOLUTIONS
PATNA

لفظ و معنی

ڈنر - رات کا کھانا

شترِ بے مہار - بے لگام اونٹ

شکم - پیٹ

رقیب - دشمن

نان - روٹی

ستم - ظلم

مہمیز - آگے بڑھانا، حرکت دینا

آپ نے پڑھا

- اس نظم میں شاعر نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز سے کھانا کھانے کی اس جدید وضع کو مزاح کا نشانہ بنایا ہے جسے انگریزی میں بوفے ڈنر کہا جاتا ہے۔ یہ طریقہ طعام مغرب کی تہذیب سے مستعار ہے اور حقیقت ہے کہ یہ ہماری مشرقی تہذیب کے لئے نامناسب ہے۔ لیکن عالمی سطح پر جس طرح مغربی تہذیب و معاشرت کے اثرات عام ہوتے جا رہے ہیں اس کی لہر کھانے کی وضع اور اس کے طریقے پر پڑ چکی ہے۔ چنانچہ آج بوفے ڈنر کا طریقہ بھی ہمارے یہاں عام ہو چکا ہے۔ شاعر اس وضع کو اچھا نہیں سمجھتے۔ انہوں نے 'کھڑا ڈنر' کے عنوان سے نظم لکھ کر اس کا مذاق اڑایا ہے۔ پانچ بندوں کی اس نظم میں انہوں نے بوفے ڈنر میں منہمک شرکاء کی مختلف تصویریں پیش کی ہیں۔

معروضی سوالات

1. سید محمد جعفری کی سنہ پیدائش کیا ہے؟

(الف) 1905 (ب) 1904 (ج) 1906 (د) 1902

2. سید محمد جعفر کے والد کا نام کیا تھا؟

(الف) مرزا جعفری (ب) سید محمد علی جعفری (ج) سید غضنفر جعفری (د) سید محمد رمضان علی

3. سید محمد جعفری کہاں پیدا ہوئے؟

(الف) حیدرآباد (ب) لاہور (ج) دلی (د) علی گڑھ

4. سید محمد جعفری کے مجموعے کا نام کیا ہے؟

(الف) شوق تحریر (ب) نامۂ تحریر (ج) شوخی تحریر (د) پیام تحریر

5. درج ذیل شعرا میں مزاح کے شاعر کون ہیں؟

(الف) رمز عظیم آبادی (ب) دلاور فگار (ج) بیکل اتساہی (د) زبیر رضوی

مختصر سوالات

1. اس نظم کا تعلق کس صنف شاعری سے ہے؟
2. زیر نصاب نظم میں شاعر نے کھانے کے کس طریقہ کار کی طنز کا نشانہ بنایا ہے؟
3. اردو کے پانچ مزاحیہ شاعروں کے نام بتائیے۔
4. سید محمد جعفری کا مختصر تعارف پیش کیجئے۔

تفصیلی سوالات

1. سید محمد جعفری کی مزاحیہ شاعری پر دس جملے لکھیے۔
2. اردو کی مزاحیہ وطنزیہ شاعری سے متعلق آپ جو جانتے ہیں لکھیے۔
3. اسم معرفہ اور اسم نکرہ کی تعریف کیجیے اور مثالیں دیجئے۔

آیئے، کچھ کریں

1. اردو کے کسی ایک مزاحیہ شاعر کے پانچ اشعار لکھیے۔
2. اردو کے دو مزاحیہ شعری مجموعوں کے نام لکھیے۔

مرثیہ

مرثیہ عربی لفظ رثاء سے بنا ہے۔ جس کے معنی رونے اور ماتم کرنے کے ہیں۔ مرثیہ اردو شاعری کی ایک مقبول صنف ہے۔ جس نظم میں کسی مرنے والے کے اوصاف بیان کئے جائیں اور اس کی موت پر رنج وغم کا اظہار کیا جائے، شاعری کی اصطلاح میں مرثیہ کہلاتی ہے۔ اردو شاعری میں یہ صنف حضرت امام حسینؑ اور شہدائے کربلا کی شہادت کے واقعات بیان کرنے اور رنج وغم کے اظہار کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ ان کے علاوہ باقی لوگوں کی موت پر اگر رنج وغم کا اظہار نظم کی صورت میں کیا جاتا ہے تو اسے شخصی مرثیہ کا نام دیا گیا ہے۔ مرنے والے کی خوبیوں کا ذکر کر کے اس پر افسوس کا اظہار کرنا مرثیہ کا بنیادی وصف ہے۔

چہرہ، رخصت، آمد، سراپا، رجز، جنگ، شہادت، بین اردو مرثیہ کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

غالب

پورا نام اسد اللہ خاں اور مرزا نوشہ لقب تھا۔ نجم الدولہ دبیر الملک جنگ شاہی خطاب تھا۔ شاعری میں پہلے پہل اسد تخلص کیا کرتے تھے۔ بعد میں تخلص غالب رکھا۔ 1797ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں تھے۔ غالب کے آباواجداد ایران سے آئے تھے۔ عبداللہ بیگ خاں آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ آئے اور وہاں سے حیدر آباد گئے۔ اور حیدر آباد میں 1802ء میں ایک لڑائی میں مارے گئے۔ اس وقت غالب کی عمر پانچ سال کی تھی۔ غالب اپنے چچا نصر اللہ خاں کی سرپرستی میں پرورش پانے لگے۔ چچا کی موت کے بعد انہوں نے رام پور کا رخ کیا۔ لیکن وہاں بھی چین نصیب نہ ہوا اور واپس دلی چلے گئے جہاں انہوں نے 1869ء میں وفات پائی۔

غالب کی شاعری کے تعلق سے ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں:

'بڑے بڑے مضمون نہایت اختصار کے ساتھ ایک شعر میں نظم کر دیتے ہیں۔ ان کے کلام کی معنویت اور بلندی عام سطح سے بے حد بلند ہے۔ غالب کی سی ہموار غزلیں مشکل ہی سے کسی دیوان میں نظر آسکتی ہیں۔'

غالب درد وغم کی داستان نہایت موثر اور مختصر الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی فلسفیانہ کاوشوں اور جدت طرازی سے اردو ادب کو رفعت بخشی ہے۔ خیال کی پاکیزگی، اسلوب کی ندرت اور زبان کی شیرینی غالب کے کلام کا خاص وصف ہے۔

پیش نظر مرثیہ، مرزا غالب نے اپنے ایک قریبی عزیز عارف کی موت پر لکھا ہے۔

ABSOL ABDIEL SOLUTIONS PATNA

عارف کی موت پر

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم کون سے تھے ایسے کھرے دادوستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

لفظ و معنی

ناصیہ	۔	پیشانی
فلک	۔	آسمان
پیر	۔	بوڑھا، ضعیف
دہم	۔	دس
دادوستد	۔	توصیفی کلمات
نادان	۔	بے وقوف، نا سمجھ

آپ نے پڑھا

- غزل کی ہیئت میں یہ رثائی نظم ہے۔ غالب نے یہ نظم اپنے رشتے کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کی موت پر کہی تھی۔ جو نظم کسی کی موت پر کہی جاتی ہے اس کو رثائی نظم یا مرثیہ کہتے ہیں جس میں مرنے والے کی خوبیوں کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اس کی موت کے غم کا اثر دوسروں پر پڑے۔ ایسی نظموں میں غم کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نظم میں بھی غالب نے اپنے جواں سال بھانجے کی موت پر غم کا اظہار کیا ہے۔

معروضی سوالات

1. غالب کا پورا نام کیا تھا؟

(الف) مجیب خاں (ب) اسد اللہ خاں (ج) نعمت اللہ خاں (د) عجائب خاں

2. غالب شاعری میں پہلے پہل کیا تخلص کرتے تھے؟

(الف) سرمد (ب) عبرت (ج) الفت (د) اسد

3. غالب کس سنہ میں پیدا ہوئے؟

(الف) 1798 (ب) 1799 (ج) 1797 (د) 1795

4. غالب کے آبا و اجداد کہاں سے ہندوستان آئے تھے؟

(الف) تہران سے (ب) عراق سے (ج) ایران سے (د) بغداد سے

5. غالب کا انتقال کس سنہ میں ہوا؟

(الف) 1858 (ب) 1856 (ج) 1855 (د) 1869

مختصر ترین سوالات

1. غزل کی ہیئت میں غالب کی اس نظم کو آپ کیا کہیں گے؟
2. غالب کی پرورش کس کے زیر سایہ ہوئی؟
3. غالب کا پورا نام لکھیے۔
4. غالب کے والد کا نام بتائیے۔

مختصر سوالات

1. صنف شاعری کی مختصر تعریف کیجیے۔
2. شخصی مرثیہ کسے کہتے ہیں؟
3. غالب کے بچپن پر پانچ جملے لکھیے۔

طویل سوالات

1. صنف مرثیہ سے اپنی تفصیلی واقفیت کا اظہار کیجیے۔
2. غالب کے حالات پر روشنی ڈالیے۔
3. غالب کی شاعری پر دس جملے لکھیے۔
4. واحد سے جمع بنائیے:

دن، فلک، بارش، شہید، رات

آیئے، کچھ کریں

1. کسی لائبریری سے کتابیں حاصل کر کے چند مرثیہ نگاروں کے مرثیے نقل کیجیے۔

مثنوی

مثنوی عربی لفظ ہے۔ لیکن اس صنف کو عرب میں زیادہ فروغ حاصل نہ ہوا۔ دراصل مثنوی فارسی کی دین ہے۔ وہاں اس صنف سے بڑا کام لیا گیا۔ فارسی مثنویوں کو اردو مثنویوں سے کہیں زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ شاہنامہ فردوسی، بوستان سعدی، سکندر نظامی اور مثنوی معنوی کسی دیوان سے کم اہم یا کم معروف نہیں۔ جبکہ اردو مثنویوں کو غزل جیسی بھی مقبولیت نہ نصیب ہو سکی۔

مثنوی کی تعریف کرتے ہوئے گیان چند لکھتے ہیں:

'مثنوی، نظم کا وہ پیکر ہے جس میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں۔ لیکن ہر شعر کے بعد قافیہ بدلتا جائے۔ دو دو ہم مصرعوں کی رعایت سے اس کا نام مثنوی طے پایا۔ کیونکہ مثنوی کے معنی ہیں 'دو دو کیا گیا' بنیادی طور پر مثنوی ایک ہیئت کا نام تھا لیکن روایت نے اس کے ہیولیٰ کا تعین بھی کردیا۔ موضوع کے لحاظ سے جس طرح غزل، قصیدہ، ریختی، واسوختہ اور مرثیہ وغیرہ ایک دوسرے سے ممتاز ہیں اسی طرح مثنوی کا نام لینے سے ہم ایک مخصوص احاطۂ فکر کا تصور کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یہ احاطہ دوسری اصناف سے کہیں زیادہ وسیع بلکہ ہمہ گیر ہے۔'

اردو مثنوی نگاروں میں مرزا شوق لکھنوی، دیا شنکر نسیم، میر حسن، شوق نیموی، ملا وجہی اور غواصی قابل ذکر ہیں۔

شوق لکھنوی

اصل نام تصدق حسین خاں تھا اور شوق تخلص۔ شوق 1783ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد آغا علی خاں تھے جو نامور طبیب تھے۔ شوق کا خاندان طبیبوں کا خاندان تھا اور لکھنؤ میں مشہور تھا۔

نواب مرزا شوق نے ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ اس کے بعد اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ سے تحصیل علم حاصل کیا اور مختلف علوم میں مہارت بہم پہنچائی۔ علم طب پر بھی دسترس حاصل تھی۔ اور طبابت کا خاندانی پیشہ اختیار کیا۔ واجد علی شاہ کے عہد حکومت میں شاہی معالج مقرر ہوئے۔ شوق لکھنوی کا انتقال 1871ء میں لکھنؤ میں ہوا۔

مرزا شوق نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ لیکن جلد ہی انھیں احساس ہوگیا کہ یہ ان کا میدان نہیں۔ چنانچہ غزل گوئی ترک کر کے مثنوی کی طرف مائل ہوئے۔ مثنوی میں شوق کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اردو شاعری میں وہ مثنوی نگار کی حیثیت ہی سے معروف ہیں۔ ان کی مثنویاں زہر عشق، بہار عشق اور فریب عشق کافی مقبول ہوئیں اور ان کی دائمی شہرت کا باعث بنیں۔ ان تینوں مثنویوں میں 'زہر عشق' کو سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

زہرِ عشق

ایک قصہ عجیب لکھتا ہوں — داستان غریب لکھتا ہوں
تازہ اس طرح کی حکایت ہے — سننے والوں کو جس سے حیرت ہے
جس محلہ میں تھا ہمارا گھر — وہیں رہتا تھا ایک سوداگر
مرد اشراف صاحب دولت — تاجروں میں کمال ذی عزت
غم نہ تھا کچھ فراغ بالی سے — تھا بہت خاندان عالی سے
ایک دختر تھی اس کی ماہ جبیں — شادی اس کی نہیں ہوئی تھی کہیں
ثانی رکھتی نہ تھی وہ صورت میں — غیرت حور تھی حقیقت میں
سبز نخلِ گلِ جوانی تھا — حسنِ یوسف فقط کہانی تھا
اس سن و سال پر کمال خلیق — چال ڈھال انتہا کی نستعلیق
چشم بدور وہ حسین آنکھیں — رشکِ چشمِ غزال چین آنکھیں
تھا جو ماں باپ کو نظر کا ڈر — آنکھ بھر نہ دیکھتے تھے ادھر
تھی زمانہ میں بے عدیل و نظیر — خوش گلو، خوش جمال، خوش تقریر
تھا نہ اس شہر میں جواب اس کا — حسن لاکھوں میں انتخاب اس کا
شعر گوئی سے ذوق رہتا تھا — لکھنے پڑھنے سے شوق رہتا تھا
تھا یہ اس گل کا جامہ زیب بدن — سادی پوشاک پر تھے سو جوبن
نور آنکھوں کا دل کا چین تھی وہ — راحت جان والدین تھی وہ
ایک دن چرخ پر جو ابر آیا — کچھ اندھیرا سا ہر طرف چھایا
کھل گیا جب برس کے وہ بادل — قوس تب آسماں پر آئی نکل

ABDIEL SOLUTIONS
ABSOL
PATNA

دل مرا بیٹھے بیٹھے گھبرایا
سیر کرنے کو بام پر آیا

خفقاں دل کا جو بہلنے لگا
اس طرف اس طرف ٹہلنے لگا

دیکھا اک سمت جو اٹھا کے نظر
سامنے تھی وہ دختِ سوداگر

ساتھ ہمجولیاں بھی تھیں دو چار
دیکھتی تھیں وہ آسماں کی بہار

بام سے کچھ اترتی جاتی تھیں
چہلیں آپس میں کرتی جاتی تھیں

رہ گئی جب اکیلی وہ گل رو
نگراں سیر کو ہوئی ہر سو

ہوئی میری جو اس کی چار نگاہ
منہ سے بے ساختہ نکل گئی آہ

حال دل کا کہا نہیں جاتا
خوب سنبھلا نہیں غش آجاتا

نہ ہوا گو کلام فی مابین
روح قالب میں ہوگئی بےچین

تیر الفت کا تھا لگا کاری
اشک بیساختہ ہوئے جاری

سامنے وہ کھڑی تھی ماہ منیر
چپ کھڑا تھا میں صورت تصویر

تاب نظارہ اتنی لا نہ سکا
کہ اشارہ سے بھی بلا نہ سکا

دیکھتا اس کو بار بار تھا میں
محوِ حسنِ جمالِ یار تھا میں

گو میں رو کے ہوئے ہزار رہا
دل پہ لیکن نہ اختیار رہا

اسی صورت سے ہوگئی جب شام
لائی پاس اس کے اک کنیز پیام

بیٹھی ناحق بھی ہولیں کھاتی ہیں
اماں جان آپ کو بلاتی ہیں

گیسو رخ پر ہمارے ہلتے ہیں
چلئے اب دونوں وقت ملتے ہیں

لفظ و معنی

صاحب دولت ۔ دولت مند

فراغ بالی ۔ آسودہ حال

تاجر ۔ تجارت کرنے والا

عالی	-	بڑا
دختر	-	لڑکی، بیٹی
ثانی	-	دوسرا، مثال
ماہ جبیں	-	خوبصورت، چاند کی طرح پیشانی
نخل	-	پیڑ
گل	-	پھول
خلیق	-	ملنسار، خوش مزاج
نستعلیق	-	تہذب
رشک	-	کسی کے برابر ہونے کی خواہش ہونا
چشم	-	آنکھ
غزال	-	ہرن
خوش گلو	-	اچھی آواز والا
خوش جمال	-	اچھی صورت والا، خوبصورت
پوشاک	-	لباس
راحت	-	اطمینان، خوشی
چرخ	-	آسمان
خفقاں	-	بے چین
قالب	-	دل
اشک	-	آنسو
کنیز	-	دائی
پیام	-	پیغام

آپ نے پڑھا

- مثنوی کے اس اقتباس میں قصہ شروع کرتے ہوئے مثنوی نگار نے ایک سوداگر کی لڑکی کا ذکر کیا ہے اور کئی اشعار میں اس کی داخلی اور خارجی خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ سوداگر کا گھر مثنوی نگار کے پڑوس میں تھا۔ اس لئے وہ اس کی

دولت و ثروت سے واقف تھا اور اس سوداگر کی شرافت کا بھی۔ وہ ایک بڑا تاجر تھا۔ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی ایک لڑکی تھی جو نہایت حسین اور خلیق تھی۔ اسے اللہ تعالیٰ نے کئی نعمتوں سے نوازا تھا۔ ان اشعار میں شاعر نے اس کا سراپا اتارنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہری خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس میں کردار کی خوبیاں بھی تھیں حد یہ ہے کہ اسے شعر گوئی کا بھی شوق تھا۔

- اس طرح کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے مثنوی نگار نے یہ بتایا ہے کہ ایک دن آسمان پر بادل چھایا ہوا تھا۔ موسم نہایت خوشگوار ہو گیا وہ تفریح کے لئے اپنے مکان کی چھت پر گیا تو اس نے دیکھا کہ سوداگر کی بیٹی بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ چھت پر محو گفتگو ہے۔ پھر اس کی سہیلیاں رخصت ہو گئیں اور وہ اکیلی رہ گئی۔ اتفاق سے ان دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور پہلی ہی نظر میں الفت کا تیر دل میں پیوست ہو گیا۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ اسے دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ شام ہو گئی اور اس خوبصورت لڑکی کی کنیز نے آ کر اسے یہ پیام سنایا کہ اس کی ماں نے اسے بلایا ہے۔ غرض دیکھتے دیکھتے یہ سحر انگیز ماحول ختم ہو گیا۔

معروضی سوالات

1. مرزا شوق کا اصل نام کیا تھا؟

(الف) محمد حامد خاں (ب) تصدق حسین خاں (ج) آغا علی خاں (د) واجد علی خاں

2. مرزا شوق کی سنہ پیدائش کیا ہے؟

(الف) 1781 (ب) 1780 (ج) 1782 (د) 1783

3. مرزا شوق کا خاندانی پیشہ کیا تھا؟

(الف) سپہ گری کا (ب) طبابت کا (ج) وکالت کا (د) کچھ نہیں

4. مرزا شوق کا انتقال کب ہوا؟

(الف) 1871 (ب) 1870 (ج) 1869 (د) 1874

5. مرزا شوق کی مثنوی کا نام بتائیے۔

(الف) قطب مشتری (ب) پھول بن (ج) فریب عشق (د) سحر البیان

مختصر سوالات

1. زیر نصاب نظم شاعری کی کس صنف سے تعلق رکھتی ہے؟

2. صنف مثنوی سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے۔
3. مثنوی نگار نے شام کا نقشہ کس طرح پیش کیا ہے؟
4. مثنوی نگار نے سوداگر کی لڑکی کی آنکھوں کی مثال کس سے دی؟
5. مثنوی کا خلاصہ بیان کیجئے۔

طویل سوالات

1. مرزا شوق لکھنوی کے حالات مختصراً بیان کیجئے۔
2. مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی نگاری پر چند سطریں لکھئے۔
3. اسم کی تعریف مع مثال کیجئے۔
4. ضد بتایئے۔

غریب، حسین، ارض، عزت، اعلیٰ

آیئے، کچھ کریں

1. استاد سے پوچھ کر پانچ مثنوی نگاروں کے نام لکھئے۔
2. شوق لکھنوی کی مکمل مثنوی 'زہر عشق' کا مطالعہ کیجئے

دیا شنکر نسیم

اصل نام دیا شنکر کول اور ان کے والد کا نام گنگا پرشاد کول تھا۔ یہ کشمیری پنڈت تھے۔ نسیم 1811ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی جائے پیدائش لکھنو ہے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق نسیم کی ابتدائی تعلیم اردو اور فارسی میں ہوئی۔ ان کے خاندان میں یہی رائج تھا۔ یہ امجد علی شاہ کا زمانہ تھا۔ نسیم کے ساتھ عمر نے وفا نہ کی اور 1845ء میں انتقال کر گئے۔

ابتدا ہی سے انہیں شعروشاعری سے لگاؤ تھا۔ آتش لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ اور اپنے استاد ہی کا رنگ اختیار کیا۔ نسیم کی شہرت کی وجہ گلزار نسیم ہے۔ یہ اردو کی اہم ترین مثنویوں میں ایک ہے۔ ان کی شاعرانہ پختگی کے لئے یہ کافی ہے کہ تقریباً دو صدیاں گزرنے کے بعد بھی مثنوی 'گلزار نسیم' کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔

دارالخلافت زین الملوک میں بکاؤلی کا پہنچنا
اور وزیر ہو کر تاج الملوک کی تلاش میں رہنا

گلچیں کا جو اب پتا ملا ہے / یوں شاخِ قلم سے گل کھلا ہے
وہ بادِ چمن چمن خراماں / یعنی وہ بکاؤلی پریشاں
گلشن سے جو خاک اڑاتی آئی / اس شہر میں آتی آتی آئی
دیکھا تو خوشی کے چہچہے تھے / گلچیں کے شگوفے کھل رہے تھے
گلبانگ زناں تھا جو جہاں تھا / ایک ایک ہزار داستاں تھا
پاتے ہی پتا خوشی سے پھولی / شاد ایسی ہوئی کہ رنج بھولی
جادو سے بنی وہ آدمی زاد / انسانوں میں آ ملی وہ پری زاد
سلطان کی سواری آرہی تھی / صورت جو نگاہ کی پری تھی
پوچھا اے آدم پری رو / انسان ہے پری ہے کون ہے تو
کیا نام ہے وطن کدھر ہے / ہے کون سا گل چمن کدھر ہے
دی اس نے دعا کہا بصد سوز / فرخ ہوں شہا میں ابن فیروز
گل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں / غربت زدہ کیا وطن بتاؤں
گھر بار سے کیا فقیر کو کام / کیا لیجیے چھوڑے گاؤں کا نام
پوچھا کہ سبب کہا کہ قسمت / پوچھا کہ طلب کہا قناعت
باتوں پہ فدا ہوا شہنشاہ / لایا بصد امتیاز ہمراہ
چہرہ سے امیر زادہ پایا / گھر لا کے وزیر اسے بنایا
نذریں لیے درگاہِ بندگاں / دستور سے آ ملے بصد جاں

لفظ ومعنی

گلچیں - پھول چننے والا، مالی

باد - ہوا

گلشن - باغ

گلبانگ - بلبل کی آواز، چہچہاہٹ

سلطان - بادشاہ

قناعت - توکل، تشفی

طلب - چاہت، مانگ

غربت - غریبی

آپ نے پڑھا

- اس اقتباس میں بکاؤلی کے آنے اور اس کے وزیر بننے کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ بادشاہ زین الملوک کے دربار میں پہنچ کر اپنی غیر معمولی اور سحر انگیز شخصیت کی وجہ سے وہ وزیر بن جاتی ہے اور پھر اپنے محبوب تاج الملوک کو تلاش کرتی ہے۔ یہاں بکاؤلی کی پریشانی کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ وہ جنگل بیابان اور اجنبی راہوں میں تاج الملوک کو تلاش کرتے کرتے جب بادشاہ زین الملوک کی مملکت میں داخل ہوتی ہے تو یہاں کا منظر ہی کچھ اور دیکھتی ہے۔ یہاں ہر طرف خوشی کے چہچہے تھے۔ باغ میں شگوفے کھل رہے تھے۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ جسے تلاش کررہی ہے وہ اسی جگہ موجود ہے۔ اس نے پری زاد ہونے کے باوجود اپنی ہیئت بدل لی اور ایک آدمی زاد کی طرح سلطان کی آتی ہوئی سواری کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ یہاں وہ مکالمہ بھی پیش کیا گیا ہے جو سلطان اور بکاؤلی کے درمیان ہوتا ہے۔ وہ اپنے کو ابن فیروز بتاتی ہے اور بادشاہ کو اس طرح متاثر کردیتی ہے کہ وہ حقیقتاً اسے آدم زاد مرد سمجھ کر اپنے دربار میں وزیر مقرر کرلیتا ہے۔ اقتباس کے آخری حصے میں مکالے کا جو کمال دکھلایا گیا ہے وہ اس حصے کی جان ہے۔

معروضی سوالات

1. نسیم کا پورا نام کیا تھا؟

(الف) ودیا شنکر نسیم (ب) روی شنکر (ج) دیا شنکر (د) کرشن شنکر

2. نسیم کہاں پیدا ہوئے؟

(الف) دہلی　(ب) دکن　(ج) لکھنو　(د) پٹنہ

3. نسیم کی مثنوی کا نام کیا ہے؟

(الف) سحرالبیان　(ب) گلزار نسیم　(ج) بوستان خیال　(د) زہر عشق

4. شاعری میں نسیم کس کے شاگرد تھے؟

(الف) غالب　(ب) آتش　(ج) ذوق　(د) حالی

5. نسیم کا انتقال کب ہوا؟

(الف) 1843　(ب) 1845　(ج) 1846　(د) 1847

مختصر ترین سوالات

1. زیر نصاب مثنوی میں کس واقعہ کو نظم کیا گیا ہے؟
2. نسیم کا پورا نام کیا تھا؟
3. نسیم کی پیدائش کب ہوئی؟
4. نسیم کی مشہور مثنوی کا نام لکھئے۔
5. نسیم کے والد کا نام لکھئے۔

مختصر سوالات

1. صنف مثنوی پر پانچ جملے لکھئے۔
2. بکاؤلی اپنے محبوب کی تلاش کے لئے کیا کیا کرتی ہے؟
3. زین الملوک کی مملکت میں پہنچ کر بکاؤلی کو کیا محسوس ہوا؟
4. نسیم کی مختصر سوانح بیان کیجئے۔
5. بکاؤلی کے کردار پر پانچ جملے لکھئے۔

طویل سوالات

1. زیر نصاب مثنوی کا خلاصہ لکھئے۔

2. دیا شنکر نسیم کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

3. دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. زیر نصاب نظم (مثنوی) کے پانچ اشعار زبانی یاد کیجیے۔

غلام ہمدانی مصحفی

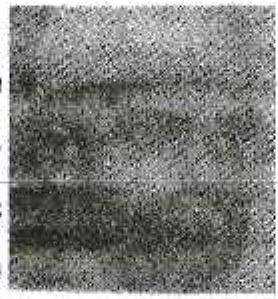

اصل نام غلام ہمدانی اور مصحفی تخلص رکھتے تھے۔ مصحفی کی پیدائش 1748ء میں امروہہ (یوپی) میں ہوئی۔ ان کے والد اکبر پور کے رہنے والے تھے جو امروہہ کے مضافات میں ایک قصبہ ہے۔ امروہہ میں مصحفی نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ شعر گوئی کا ذوق بھی اسی زمانے سے تھا۔ اسی زمانے سے وہ بعض شعری محفلوں میں بھی جاتے تھے۔ اسی دوران ان کی تعلیم بھی ہوتی رہی۔ امروہہ سے پھر بریلی چلے گئے۔ سن بلوغ میں آنولہ تشریف لائے۔ تکمیل تعلیم کے بعد ٹانڈہ گئے اور نواب محمد یار خان کے ملازم ہوئے۔ پھر لکھنو آگئے۔ لکھنو سے دلی گئے۔ کچھ دنوں کے بعد دوبارہ لکھنو واپس آگئے۔ یہاں شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کے ملازم ہوئے۔ مصحفی کے قیام لکھنو کے زمانے میں جرأت کی شہرت بہت زیادہ تھی۔ مصحفی بھی ایک قادرالکلام شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے اس لئے مصحفی اور جرأت کے درمیان انیس و دبیر کی طرح اکثر رقابت رہتی تھی۔

مصحفی کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ اردو فارسی کے علاوہ عربی پر بھی عبور رکھتے تھے۔ فارسی اور اردو کے آٹھ دیوان ان کی یادگار ہیں شاعری میں قادرالکلامی ان کا وصف خاص تھی۔ لیکن وہ نثر سے بھی خاصی دلچسپی لیتے رہے۔ چنانچہ فارسی کے شعراء کے تذکرے کے علاوہ انہوں نے دو تذکرے اردو کے بھی قلم بند کئے۔

مصحفی شاعری کی کسی خاص صنف کے پابند نہیں تھے۔ انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور قصائد بھی۔ کئی مثنویاں بھی ان کی یادگار ہیں۔ مصحفی کے شاگردوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ کئی تو بڑے نامور شاگرد ہوئے مثلاً میر ضمیر، میر خلیق، آتش لکھنوی اور اسیر وغیرہ۔

مصحفی کے کلام میں ملکی خصوصیات اور مقامی رنگ کے علاوہ حب وطن کا جذبہ خاص طور پر نمایاں ہے۔ مصحفی کی عشقیہ مثنویاں قابل لحاظ ہیں۔ ان میں مثنوی 'بحر المحبت' مشہور ہے۔ دوسری مثنویاں مثلاً سردی، طفل حجام، اجوائن، غریب خانہ مصحفی، موذی خانہ اور کھٹمل نامہ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ 1824ء میں مصحفی کا انتقال ہوگیا۔

جذبۂ عشق

خاک دہلی میں اک جوان حسین
صاحب وضع، صاحب تمکین
تھا شکار خدنگ کاری عشق
دل میں رکھتا تھا بے قراری عشق
رات دن اشک جاری رہتے تھے
اس کی چشموں سے چشمے ابلتے تھے
دل میں رکھتا تھا بس کہ پنہاں درد
گل سرخ اس کا ہوگیا تھا زرد
گرچہ تھا جوہری وہ پاک نژاد
عشق تھا اس میں جوہر فولاد
عاشق زار اپنی زن پہ تھا
بلبل اس خانگی چمن پہ تھا
نہ وہ زن تھی رقم جواہر کی
کیا کروں وصف حسن و زیور کی
رنگ کندن سا جو دمکتا تھا
جس میں جوبن پڑا چھلکتا تھا

دی تھی نازکی نے اس کو بہار
جس سے ہر عضو اس کا تھا گلزار

دیکھ کافر کی شوخی رفتار
دنگ رہتے تھے مردم بازار

دیکھ وہ اس کے گوہر دندان
تھا بہت اپنے کام میں حیران

گھر سے بازار تک اگر جاتا
دو قدم چل کر وہ وہیں پھر آتا

اس کے بن دیکھے رہ نہ سکتا تھا
رات دن اس کے منہ کو تکتا تھا

دل نہ لگتا تھا جبکہ اور کہیں
قبلہ کرتا تھا اس صنم کے تئیں

گاہ پاؤں پہ سر کو رکھتا تھا
گاہ چٹ چٹ بلائیں ہی لیتا

عشق کی طبع میں مدارا تھیں
گالی کیا دھولیں بھی گوارا تھیں

گاہ ناخوش تو گاہ خوش ہوتی
گاہ ہنستی تو گاہ پھر روتی

دن بہ دن چاہ بڑھتی جاتی تھی
مرگ دیکھ ان کو مسکراتی تھی

عیش و عشرت میں پا کے ان کے تئیں
کیا دونوں پہ چشم بدنے کمیں

زوجہ جوہری تھی نرم خرام
پنہ لیتی تھی اس سے نرمی وام

حال اپنا سبھوں کو دکھلا کر
بستر عشق پہ گر پڑی جاکر

چشم بیمار اس کی ہو کے نزار
بن گئی اشک نرگس بیمار

اس کی ماں بہنیں اور ہمسائیں
دیکھ کر اس کو سخت گھبرائیں

کوئی بولی ہے اس کو دردِ جگر
کوئی بولی اسے لگی ہے نظر

بعد یک چند وہ زن بیمار
اسی حالت میں مرگئی یک بار

لفظ و معنی

آغاز - شروع
خاک - مٹی
وضع - طریقہ
تمکین - شان، وجاہت
بے قراری - بے چینی
اشک - آنسو
چشمہ - تالاب

پنہاں	-	چھپا ہوا
گلِ سرخ	-	لال پھول
زرد	-	پیلا
نژاد	-	نسل، خاندان
جوہر	-	ایٹم، ہیرا
فولاد	-	لوہا
زن	-	عورت
خانگی	-	گھریلو
وصف	-	خوبی، خصوصیت
کندن	-	چمکیلا، ہیرا
دمکتا	-	چمکتا ہوا
نازکی	-	نزاکت
عضو	-	حصہ
رفتار	-	چال
دنگ رہنا	-	حیرت میں پڑ جانا
مردم	-	لوگ
دندان	-	دانت
صنم	-	بت، محبوب
گاہ	-	کبھی
مرگ	-	موت
طبع	-	طبیعت
چشمِ بد	-	بری نظر

آپ نے پڑھا

- زیرِ نصاب مثنوی 'جذبۂ عشق' غلام ہمدانی مصحفی کی تصنیف ہے۔ چونکہ مثنوی طویل نظم کی ایک قسم ہے جس میں

رزمیہ اور بزمیہ دونوں طرح کی طویل داستانیں بیان ہوتی ہیں۔ اس میں بھی عشق و محبت کی داستان کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

- مثنوی 'جذبۂ عشق' بھی اس زمرے کی مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں دہلی کے ایک رئیس خاندان کے ایک نوجوان کے عشق و محبت کی کہانی ہے۔ اس داستان عشق کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ وہ نوجوان اپنی بیوی پر ہی عاشق تھا۔ محبوب کے حسن و جمال اور اس کے اعضاء کی خصوصیات اس میں بیان کی گئی ہے۔ بدقسمتی سے وہ عورت سخت بیمار ہو جاتی ہے۔ ہر طرح کا علاج کیا گیا مگر سب لاحاصل۔ اسی طرح صاحب فراموش رہ کر وہ چند دنوں کے بعد راہی ملک عدم ہوئی اور اپنے عاشق کو رونے اور غم فراق میں تڑپنے کے لئے چھوڑ گئی۔

مختصر ترین سوالات

1. مصحفی کا پورا نام کیا تھا؟
2. مصحفی کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟
3. مصحفی کی زیر نصاب مثنوی کا عنوان بتائیے۔

مختصر سوالات

1. مصحفی کی ابتدائی زندگی کا مختصر جائزہ لیجیے۔
2. صنف مثنوی پر پانچ جملے لکھیے۔
3. مصحفی کی شعری تخلیقات کو لکھیے۔

طویل سوالات

1. مثنوی کے آغاز و ارتقاء پر روشنی ڈالیے۔
2. مصحفی کی شاعرانہ خصوصیات بیان کیجیے۔

آئیے، کچھ کریں

1. اردو مثنوی کی ارتقائی تاریخ پر ایک مذاکرہ کیجیے۔
2. مصحفی کی زیر نصاب مثنوی 'جذبۂ عشق' کا خلاصہ پیش کیجیے۔

غزل

غزل عربی قصیدے کی تشبیب سے ماخوذ ہے۔ تشبیب کا تعلق شباب یعنی جوانی یا جوانی کے جذبات سے ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جوانی کے جذبات میں حسن وعشق کی کیفیات شامل ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے فارسی اور اردو غزلوں میں حسن وعشق کے جذبات کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ لیکن دور حاضر میں غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں حیات اور کائنات کے مختلف مسائل سمیٹے جاسکتے ہیں۔ یعنی غزل کے موضوعات اور مضامین کی کوئی قید نہیں رہ گئی ہے۔

غزل کی شکل یا ہیئت مقرر ہے۔ اس میں ابھی تک کسی طرح کی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اس کا پہلا شعر، جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں، مطلع کہلاتا ہے۔ کسی کسی غزل میں ایک سے زیادہ مطلع ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں دوسرے مطلع کو مطلع ثانی یا حسن مطلع کہتے ہیں اور تیسرے مطلع کو مطلع ثالث کہا جاتا ہے۔ غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔ لیکن بعض غزلیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں کبھی مطلع نہیں ہوتا تو کبھی مقطع نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود انہیں غزل ہی کہتے ہیں۔ البتہ ایسی غزلوں میں ایک طرح کی کمی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض ایسی غزل بھی ہوتی ہے جس میں ردیف نہیں ہوتی۔ چنانچہ بغیر ردیف والی غزل کو غیر مردف غزل کہتے ہیں۔

دور حاضر میں مختلف ادبی اصناف میں کئی طرح کے تجربے کئے گئے ہیں۔ غزل جیسی نازک صنف میں بھی تجربے ہوئے ہیں اور آزاد غزلیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن جس طرح تمام تجربے کا کامیاب ہونا ضروری نہیں۔ اسی طرح ضروری نہیں تھا کہ آزاد غزل کا تجربہ بھی کامیاب ہوتا۔ اس لئے اب آزاد غزل کا تجربہ بھی ناکام ہو چکا ہے۔ یہ تجربہ ہیئتی تبدیلی کا تھا، کوشش کی گئی تھی کہ اس کی ہیئت یا شکل میں کسی قدر تبدیلی لائی جائے۔ اس تجربے کی ناکامی سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس کی ہیئت تبدیل نہیں کی جاسکتی لیکن اس کے موضوعات اب محدود نہیں رہے ہیں۔ پہلے بھی عاشقانہ، رندانہ، صوفیانہ اور عارفانہ خیالات کے اظہار کا وسیلہ غزل کو بنایا گیا تھا اور آج سائنسی، نفسیاتی اور دوسری قسموں کے موضوعات پر بھی غزلیں کہی جاتی ہیں۔

اردو غزل ولی دکنی سے پہلے بھی کہی جاتی تھی لیکن ولی نے اسے خاص معیار بخشا۔ جب ولی کے ذریعے غزل شمال میں پہنچی تو میر، مومن، غالب جیسے شعرا پیدا ہوئے۔ اس کے بعد اقبال فیض اور فراق نے بھی غزل گوئی کی روایت کو مضبوط اور مستحکم کیا۔ غزل کے اشعار کی تعداد کا تعین بھی مشکل ہے۔ ویسے کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ سترہ یا انیس اشعار کی غزل ہونی چاہئے۔

ABSOL

مبارک عظیم آبادی

ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی فدا حسین واثق کے بیٹے تھے جن کا تعلق بابا فرید گنج شکرؒ کی اولاد میں سے ہے۔ ان کی پیدائش 21 اپریل 1869ء کو عصر کے وقت جمعہ کے دن تاج پور ضلع دربھنگہ میں ہوئی تھی۔ انہوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ مبارک عظیم آبادی بھی حضرت مولانا سید شاہ بدرالدین قدس سرہ سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ کے دست مبارک پر قادریہ سلسلے میں بیعت کا شرف رکھتے تھے۔ ان کا طریقہ صلح کل کا تھا۔ کسی دوسرے مذہب سے انہیں نہ تو کوئی تعرض تھا نہ تعصب۔

جب معاش کی فکر ہوئی تو طب کی طرف متوجہ ہوئے اور طب سے متعلق فارسی میں دو کتابیں لکھیں 'میزان الطب' اور 'طب اکبیر' لیکن جلد ہی طبیعت اچاٹ ہوگئی اور تب چھ سال تک ہومیو پیتھی کی تعلیم حاصل کی اور اپنا مطب کھولا۔ مبارک حسین عظیم آبادی شمس العلماء امداد امام اثر کے بھانجی داماد تھے۔ مبارک کے والد فدا حسین واثق بھی شاعر تھے اور سید حسن حسرت کے شاگرد۔ ان کے مورث اعلیٰ ملا قاضی یار محمد کو 1085ء ہجری میں عہدۂ قضا یعنی منصفی کا عہدہ ملا۔ اس عہدے سے سبکدوش ہوئے تو اورنگ زیب کے چھوٹے بیٹے کی اتالیقی پر مامور ہوئے گویا مبارک ایک علمی، ادبی اور معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور شاعری انہیں وراثت میں ملی تھی۔ انہوں نے اردو ہی میں نہیں بلکہ فارسی میں بھی شاعری کی۔ فارسی میں وہ حکیم عبدالحمید پریشاں سے اصلاح لیتے تھے۔ جبکہ اردو میں وہ داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔

مبارک عظیم آبادی نے ایک بار حیدر آباد دکن کا سفر بھی کیا تھا اور سر عبدالعزیز کے یہاں قیام فرما ہوئے تھے جو ان دنوں وہاں کے اہم وزیر تھے۔ مبارک کلکتے گئے تو انہوں نے وہاں وحشت سے ملاقات کی۔

مبارک عظیم آبادی 1892ء میں داغ کے شاگرد ہوئے اور داغ کے وصال (1905ء) تک ان سے اصلاح سخن لیتے رہے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام پر داغ کا رنگ نمایاں ہے۔ اس رنگ کے علاوہ ان کے یہاں تصوف کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ انہوں نے رندانہ غزلیں بھی کہی ہیں اور شراب کے جام خوب خوب لنڈھائے ہیں۔

مبارک عظیم آبادی کے منتخب کلام کا مجموعہ 'جلوۂ داغ' کے نام سے 1951ء میں شائع ہوا۔ 1954ء میں حکومت ہند نے ان کی ادبی کارگزاریوں کا اعتراف کرتے ہوئے مبلغ 100 روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔

مبارک عظیم آبادی نے پٹنہ سیٹی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے لمبی عمر پائی۔ ان کا انتقال 12 دسمبر 1958ء کو ہوا۔ یعنی وہ تقریباً 90 برسوں تک زندہ رہے جن میں 70 برس شعر و شاعری میں گزاری۔

غزلیں

مبارک عظیم آبادی

(۱)

ساعتیں گزریں جو غفلت میں سمجھ لے کھو گئیں
پھر کے آنے کی نہیں ناداں گھڑیاں جو گئیں

کیا کہیں کیا کیا تیری نگاہوں نے سلوک
دل میں آئیں دل میں ٹھہریں دل میں کانٹے بو گئیں

گھر شب وعدہ مرا ماتم سرا سے کم نہ تھا
تم نہ آئے حسرتیں آ آ کے مجھ کو رو گئیں

سوزِ دل سے اشک آنکھوں میں توے کی بوند ہے
اور وہ یوں طعنہ زن ساون کی جھڑیاں ہو گئیں

(۲)

گر گئے افسوس کس کس کی نظر سے کیا کہیں
ہم ہوئے کیا کیا خجل اس چشم تر سے کیا کہیں

یوں بھی کہتا ہے کسی سے کوئی اپنا حالِ زار
آپ تو سنتے نہیں دیوار و در سے کیا کہیں

سن رہے ہیں ناصحِ نافہم کی ہم دم بخود
کہہ رہا ہے ہم سے کیا اس بے خبر سے کیا کہیں

دردمندانِ محبت کا یہ کیا جانیں علاج
چارہ گر کی کیا سنیں ہم چارہ گر سے کیا کہیں

ہر قدم پر خوش جمالوں میں مبارک ہم لٹے
کیسی کیسی صورتیں گزریں نظر سے کیا کہیں

لفظ و معنی

ساعت	-	وقت
غفلت	-	بے خیالی، بے پروائی، بھول چوک، غلطی
گھڑی	-	لمحہ، پل
سلوک	-	برتاؤ
شب	-	رات
ماتم سرا	-	ماتم خانہ، غم خانہ، وہ گھر جو رونے یا ماتم کرنے کے لئے مخصوص ہو
حسرت	-	کسی چیز کے نہ ملنے کا ملال
سوز	-	جلن
بوند	-	قطرہ
طعنہ	-	طنز، آوازہ
طعنہ زن	-	طنز کرنے والا، آوازہ کسنے والا
آرزو	-	تمنا، خواہش، ارمان
بو	-	مہک
جستجو	-	تلاش، کھوج
پا، پائے	-	پیر، پاؤں
گفتگو	-	بات، بات چیت
نشاط	-	خوشی، شادمانی، فرحت
خوب رو	-	خوبصورت، اچھی صورت والا

آپ نے پڑھا

- مبارک عظیم آبادی کی شامل نصاب دو غزلوں کے مطالعہ سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ وہ قدیم وضع کے شاعر ہیں اور ان کا شعری انداز بھی روایتی ہی ہے۔ حسن و عشق کی مختلف کیفیات کو انہوں نے بڑی شوخی اور بے باکی کے ساتھ شعری پیکر عطا کیا ہے۔ ان کا یہ کلام جملہ شعری محاسن سے مزین ہے۔ انداز بیان سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ زبان

صاف، سادہ، سہل اور عام فہم ہے۔ ژولیدہ بیانی نہیں بلکہ شعر میں سلاست اور روانی ہے۔ خیالات کا ذریعۂ ترسیل ایسا ہے کہ بات شاعر کے دل سے نکلتی ہے اور قاری کے دل میں جا کر بیٹھ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ان اشعار کو دیکھئے:

سوز دل سے اشک آنکھوں میں توے کی بوند ہے
اور وہ یوں طعنہ زن ساون کی جھڑیاں ہوگئیں

یوں بھی کہتا ہے کسی سے کوئی اپنا حال زار
آپ تو سنتے نہیں دیوار و در سے کیا کہیں

مختصر ترین سوالات

1. مبارک عظیم آبادی کہاں پیدا ہوئے؟
2. مبارک عظیم آبادی کا سال پیدائش کیا ہے؟
3. مبارک عظیم آبادی کا انتقال کب ہوا؟
4. مبارک عظیم آبادی کے والد کا نام کیا تھا؟
5. اردو شاعری میں مبارک عظیم آبادی کے استاد کون تھے؟
6. فارسی شاعری میں مبارک عظیم آبادی کے استاد کون تھے؟
7. مبارک عظیم آبادی کے شعری مجموعہ کا نام کیا ہے؟
8. مبارک عظیم آبادی کا شعری مجموعہ کب شائع ہوا؟
9. حکومت ہند نے مبارک عظیم آبادی کی ادبی کارگزاریوں کا اعتراف کب کیا؟
10. حکومت ہند نے مبارک عظیم آبادی کی ادبی کارگزاریوں کا اعتراف کرتے ہوئے کتنا وظیفہ مقرر کیا؟

مختصر سوالات

1. مبارک عظیم آبادی نے حیدرآباد دکن کے سفر میں کس سے ملاقات کی اور کس کے یہاں قیام فرما ہوئے؟
2. مبارک عظیم آبادی نے کس کے ہاتھ پر بیعت کی تھی؟
3. علم طب پر مبارک عظیم آبادی نے جو کتابیں لکھیں، ان کے نام لکھیے۔

4. دونوں غزلوں کے قافیوں کی پہچان کیجیے اور کس غزل میں کتنے قافیے ہیں ان کی تعداد الگ کیجیے۔

طویل سوالات

1. مبارک عظیم آبادی کی شاعری پر کس کا رنگ نمایاں ہے؟
2. مبارک عظیم آبادی کے کلام میں داغ کے رنگ کے علاوہ اور کون کون سے رنگ نمایاں ہیں؟
3. مبارک عظیم آبادی کے کلام کی خصوصیات قلم بند کیجیے۔
4. نصاب میں شامل مبارک عظیم آبادی کی کسی ایک غزل کے ادبی محاسن قلم بند کیجیے۔
5. درج ذیل سابقے اور لاحقے سے نئے الفاظ بنائیے:

مند، کار، زار، بے، اہل

آیئے، کچھ کریں

1. مبارک عظیم آبادی کی کسی ایک غزل کو زبانی یاد کیجیے۔

احمد فراز

احمد فراز کی پیدائش 1933 میں پشاور میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ان کا گھریلو ماحول ادبی اور شاعرانہ تھا، اسی ماحول میں انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں اور کم عمری میں ہی شعروشاعری کی طرف مائل ہوگئے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی وہ شعر کہنے لگے تھے اور یہ سلسلہ زندگی کے آخری دور تک جاری رہا۔ ان کی ادبی اور شعری خدمات قابل قدر ہیں جس کا اعتراف کرتے ہوئے کراچی یونی ورسٹی نے انہیں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ انہوں نے چند رسالوں کی ادارت بھی کی۔ ماہنامہ 'اشتیاق' اور 'داستان' اور ہفتہ وار 'خادم' بھی ان کی ادارت میں شائع ہوئے۔

احمد فراز کئی اہم عہدوں پر بھی فائز رہے۔ مثلاً وہ پشاور یونی ورسٹی میں لکچرر بھی ہوئے۔ ڈائرکٹر جنرل آف لیٹریچرز بھی رہے اور نیشنل بک فاؤنڈیشن، پاکستان کے مینجنگ ڈائرکٹر بھی بنے۔

احمد فراز پاکستان کے بے حد مقبول شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی شہرت پاکستان سے باہر بھی دور دور ممالک میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دوسرے ملکوں کے مشاعرے میں بھی بلائے جاتے رہے تھے۔ حال ہی میں اپنی موت سے ذرا پہلے 2009 میں وہ دربھنگہ (بہار) کے مشاعرے میں بھی تشریف لائے تھے اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اردو کے عالمی شہرت یافتہ شاعر تھے۔ ان کی شہرت و مقبولیت میں غزل گائکوں نے بھی چار چاند لگایا۔ ان سب باتوں سے ان کی کافی حوصلہ افزائی ہوئی۔ چنانچہ ان کی شاعری کا سفر کہیں رکا نہیں اور ان کے بارہ مجموعے شائع ہوئے جو حسب ذیل ہیں:

تنہا تنہا، دردِ آشوب، نایافت، شب خون، میرے خواب ریزہ ریزہ، جاناں جاناں، بے آواز گلی کوچوں میں، نابینا شہر میں آئینہ، سب آوازیں میری ہیں، پس انداز موسم، خواب گل پریشاں ہے، غزل بہانہ کروں۔ واضح ہو کہ 1987 میں یونی ورسٹی الیعین نے احمد فراز کے کلام کو 'اثاثہ' کے نام سے چار جلدوں میں شائع کیا۔

احمد فراز بنیادی طور پر رومانی مزاج کے شاعر ہیں۔ وہ عورتوں کے حسن و جمال سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ حسن و عشق ان کی شاعری کے موضوعات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری عوامی حلقے میں بے حد مقبول ہوئی۔ سہل ممتنع میں شعر کہنا اور اس انداز سے کہنا کہ عوام و خواص کے دلوں میں وہ اپنی جگہ بنالے، ایک بڑی بات ہے، یہ کام احمد فراز نے بہت ہی آسانی کے ساتھ کیا ہے۔ ان کی بہت سی غزلیں عام انداز کی ہونے کے باوجود عوام پسند ہیں اور ساتھ ہی ساتھ خواص پسند بھی۔ اسی لئے ہر خاص و عام میں وہ بے حد مقبول ہیں۔

ABSOL

احمد فراز

(۱)

دولتِ درد کو دنیا سے چھپا کر رکھنا
آنکھ میں بوند نہ ہو دل میں سمندر رکھنا

کل گئے گزرے زمانوں کا خیال آئے گا
آج اتنا بھی نہ راتوں کو منوّر رکھنا

اپنی آشفتہ مزاجی پہ ہنسی آتی ہے
دشمنی سنگ سے اور کانچ کا پیکر رکھنا

آس کب دل کو نہیں تھی ترے آجانے کی
پر نہ ایسی کہ قدم گھر سے نہ باہر رکھنا

ذکر اس کا سبھی بزم میں بیٹھے ہو فراز
درد کیسا ہی اٹھے ہاتھ نہ دل پر رکھنا

(۲)

تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

اپنی محرومی کے احساس سے شرمندہ ہیں
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بجھاتے ہیں چراغ

بستیاں دور ہوئی جاتی ہیں رفتہ رفتہ
دمبدم آنکھوں سے چھپتے چلے جاتے ہیں چراغ

کیا خبر ان کو کہ دامن بھی بھڑک اٹھتے ہیں
جو زمانے کی ہواؤں سے بچاتے ہیں چراغ

گو سیہ بخت ہیں ہم لوگ پہ روشن ہے ضمیر
خود اندھیرے میں ہیں دنیا کو دکھاتے ہیں چراغ

بستیاں چاند ستاروں کی بسانے والو
کرۂ ارض پہ بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ

ایسے بے درد ہوئے ہم بھی کہ اب گلشن پر
برق گرتی ہے تو زنداں میں جلاتے ہیں چراغ

ایسی تاریکیاں آنکھوں میں بسی ہیں کہ فراز
رات تو رات ہے ہم دن کو جلاتے ہیں چراغ

لفظ و معنی

دولتِ درد	-	درد کی دولت
منور	-	روشن
آشفتہ	-	منتشر، بکھرا ہوا
سنگ	-	پتھر
کانچ	-	شیشہ
پیکر	-	ڈھانچہ، جیوتی
آس	-	امید
بزم	-	محفل
چراغ	-	دیا
محرومی	-	مایوسی
رفتہ رفتہ	-	دھیرے دھیرے
دم بہ دم	-	لگاتار، سلسلہ وار
سیہ	-	کالا، اندھیرا، تاریک
بخت	-	مقدر، تقدیر، قسمت
سیہ بخت	-	بدقسمت، بدنصیب
ضمیر	-	روح، دل
کرّہ	-	سیارہ
ارض	-	زمین
گلشن	-	چمن، پھلواری
برق	-	بجلی
زنداں	-	قید خانہ، جیل
تاریکی	-	اندھیرا

آپ نے پڑھا

- آپ نے احمد فراز کی دو غزلیں پڑھیں۔ پہلی غزل پانچ جبکہ دوسری غزل آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ دونوں غزلیں بہت خوب ہیں اور اپنے دامن میں غزل کے تمام محاسن سمیٹے ہوئی ہیں۔ حسن و عشق کی مختلف کیفیات کو نہایت ہی سادگی کے ساتھ مگر پرتاثیر انداز میں شعری پیکر عطا کیا گیا ہے۔
- ان غزلوں کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی اجاگر ہوتی ہے کہ احمد فراز بنیادی طور پر رومانی مزاج کے شاعر ہیں اور ان کی شاعری کا محور روایتی حسن و عشق ہی ہے۔ اشعار میں کوئی لفظی ثقالت نہیں یہ بالکل آسان، سہل اور عام فہم ہیں اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ احمد فراز عوام پسند شاعر بھی ہیں۔ انہیں الفاظ کے حسن استعمال کا ہنر اچھی طرح معلوم ہے۔ یہ ہنر سب کے بس کی بات نہیں۔ اور یہی وہ خوبی ہے جو انہیں دیگر غزل گو شعرا سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. احمد فراز کی پیدائش کب ہوئی؟
2. احمد فراز کہاں پیدا ہوئے؟
3. احمد فراز کس یونی ورسٹی میں لکچرر رہے؟
4. احمد فراز کس ادارہ کے مینجنگ ڈائرکٹر ہوئے؟
5. اپنی موت سے کچھ ہی دنوں پہلے وہ بہار کے کس صوبے کے مشاعرے میں تشریف لائے تھے؟
6. احمد فراز کی شاعری کے کتنے مجموعے شائع ہوئے؟

مختصر سوالات

1. احمد فراز بنیادی طور پر کس مزاج کے شاعر ہیں؟
2. احمد فراز کی شاعری کا اصل محور کیا ہے؟
3. احمد فراز کی شاعری کس کس حلقے میں مقبول ہوئی؟
4. احمد فراز کی ادارت میں کون کون سے ماہنامے اور ہفتہ وار شائع ہوئے؟
5. اردو غزل کی روایت میں آزاد غزل کا تجربہ کیسا رہا؟

6. غزل عربی کی کس صنف سے ماخوذ ہے؟
7. جس غزل میں ردیف نہ ہو اس غزل کو کیا کہتے ہیں؟
8. دکن کے کس شاعر کے ذریعہ اردو غزل شمال تک پہنچی؟
9. غزل کے پہلے شعر کو کیا کہتے ہیں؟
10. غزل کے آخری شعر کو کیا کہتے ہیں؟

طویل سوالات

1. احمد فراز کے حالات زندگی پر روشنی ڈالئے۔
2. احمد فراز کی زیر نصاب غزل کے پہلے اور آخری شعر کی تشریح کیجئے۔
3. صنفِ غزل سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے۔
4. درج ذیل الفاظ کی ضد بتائیے:

حق، نشیب، ظلم، کثرت، زیاں

آئیے، کچھ کریں

1. احمد فراز کے مجموعوں کی فہرست تیار کیجئے۔
2. احمد فراز کی ادارت میں شائع شدہ ماہنامے اور ہفتہ وار کی فہرست مرتب کیجئے۔

حسن نعیم

حسن نعیم کا اصل نام سید حسن تھا لیکن وہ حسن نعیم کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ 6رجنوری 1924ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ حسن نعیم ایک ذی وقار خاندان کے فرد تھے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت مخدوم کے واسطے سے حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے۔ گھر میں رئیسی اور زمینداری تھی لیکن وہ قائم نہ رہ سکی۔ انہوں نے اعلیٰ درجے کی ملازمت حاصل کی۔ وہ ہندوستان کے وزارت خارجہ سے وابستہ تھے لیکن ایک موقع پر کسی وجہ سے ملازمت سے مستعفی ہوگئے۔ ملازمت گئی تو مالی حالت خراب ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی زمین جائداد فروخت کرنے لگے۔ یہاں تک کہ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ وہ غالب انسٹی ٹیوٹ، دلی کے ڈائرکٹر ہوئے لیکن اپنی نازک مزاجی کی وجہ سے اس نوکری سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ آخری وقتوں میں حالات بہت ہی پریشان کن ہوگئے تھے۔ صحت بھی خراب رہنے لگی۔ غربت اور افلاس کی وجہ سے صحیح ڈھنگ سے ان کا علاج بھی نہیں ہوسکا۔ ایسے ہی حالات میں ممبئی کے کسی کونے میں ان کا انتقال 22رفروری 1991ء کو ہوا۔

حسن نعیم نے ابتدا میں فنی اور عروضی نکات فصیح الدین بلخی سے سیکھے تھے۔ اور بعض دوسرے بزرگوں نے بھی شاعری کے باب میں ان کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ جن میں بسمل عظیم آبادی، جمیل مظہری اور معین احسن جذبی قابل ذکر ہیں۔

حسن نعیم نے کلاسیکی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ مومن اور غالب سے بھی متاثر ہوئے تھے۔ لیکن وہ تقلید پسند نہ تھے، اس لئے انہوں نے اپنی راہ سب سے الگ نکالی۔ وہ نئی غزل کے ایک ایسے شاعر تھے جو جدیدیت کی رسم سے واقف تھے لیکن ان کے لہجے میں اکثر احتجاج کا رنگ بھی شامل ہوجاتا تھا۔ اس کے باوجود دردمندی اور حسن و عشق کی کیفیت بھی اکثر ظاہر ہوتی رہی جو کلاسیکی شاعری کی جان سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری کئی رنگوں سے مل کر ایک خاص رنگ اختیار کرلیتی ہے جو انہیں جدید شاعروں کے درمیان انفرادیت عطا کرتی ہے۔

حسن نعیم

(۱)

قلب و جاں میں حسن کی گہرائیاں رہ جائیں گی
تو وہ سورج ہے تیری پرچھائیاں رہ جائیں گی

اہل دل کو یاد صدیوں آئے گا میرا جنوں
شہرتیں ہوں گی فنا رسوائیاں رہ جائیں گی

گفتگو تجھ سے کریں گی میری غزلیں صبح و شام
تیری خلوت میں میری تنہائیاں رہ جائیں گی

میں نکل جاؤں گا اپنی جستجو میں ایک دن
بزمِ یاراں میں خیال آرائیاں رہ جائیں گی

دور تک کوئی نہ ہوگا نغمہ سنجوں میں نعیم
بس چمن میں یاد کی پُروائیاں رہ جائیں گی

(۲)

فسانہ غم کا کوئی غم گسار ہو تو کہیں
کہانی دل کی کوئی دل فگار ہو تو کہیں

وہاں یقین کہ خود ہی کہیں گے حرف جنوں
یہاں یہ فکر فضا سازگار ہو تو کہیں

جنوں کی کون سی منزل میں مل رہا ہے سکوں
ہماری طرح کوئی بے قرار ہو تو کہیں

کہیں فسانۂ ہجراں یہ ربطِ ذکرِ وفا
کسی کا اب نہ تمہیں انتظار ہو تو کہیں

اسی میں چھیڑا نہ ہم نے فسانۂ شبِ غم
کہ ان کی شام بھی کچھ سوگوار ہو تو کہیں

وہ مسکرائے کہ برہم ہوئے گذارش پر
جو اپنی آنکھوں پہ کچھ اعتبار ہو تو کہیں

کہانی دورِ جنوں کی کہیں تو کس سے نعیم
جہاں میں ہم سا کوئی غم شعار ہو تو کہیں

لفظ و معنی

جنون	۔	دیوانگی، دیوانہ پن
صدی	۔	سو سال کی مدت
رسوائی	۔	بدنامی
خلوت	۔	تنہائی
جستجو	۔	تلاش
نغمہ سنج	۔	گانے والا، گنگنانے والا
غم گسار	۔	غم خوار، ہمدرد، دوست
دل فگار	۔	زخمی دل والا
فضا	۔	ماحول
ہجراں	۔	جدائی، فراق
ربط	۔	تعلق
برہم	۔	ناراض
غم شعار	۔	غم کو سمجھنے والا
سازگار	۔	موافق، حسب حال

آپ نے پڑھا

- پانچ اشعار پر مشتمل اس غزل میں مایوسی اور محرومی کے احساس کی جھلک ملتی ہے۔ مثلاً دوسرے شعر میں شاعر یہ کہتا ہے کہ سیکڑوں برسوں کے بعد بھی میرا دیوانہ پن دل والوں کو یاد آتا رہے گا۔ لیکن میری نیک نامیاں مٹ جائیں گی اور بدنامیاں موجود رہیں گی۔ یعنی میری شہرت کی وجہ میری اچھائی نہیں، برائی ہی رہے گی۔ اس طرح اس شعر میں مایوسی کے احساس کی جھلک ملتی ہے۔
- یہ غزل سات اشعار پر مشتمل ہے۔ اس غزل کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا جاسکتا ہے کہ کوئی شخص اپنا دکھ درد یا اپنا حال کسی دوسرے سے بیان کرتا ہے تو اس کے لئے وقت اور ماحول بھی سازگار ہونا چاہئے۔ دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ کسی کے دکھ درد کا احساس صحیح طور پر اسی کو ہوسکتا ہے جو خود بھی اسی دکھ درد سے گزرا ہو۔ چنانچہ مقطع میں شاعر کہتا ہے کہ دیوانہ پن کے زمانے کی کہانی کس سے کہیں؟ البتہ اس دنیا میں اگر کوئی ہمارے جیسا ہی غم کا مارا اور

غم کا سمجھنے والا ہو تو کہہ سکتے ہیں۔

مختصر ترین سوالات

1. حسن نعیم کی پیدائش کہاں ہوئی؟
2. حسن نعیم کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟
3. حسن نعیم کس ملازمت سے مستعفی ہوئے؟
4. حسن نعیم کس ادارہ میں ڈائرکٹر کے عہدہ پر مامور تھے؟

مختصر سوالات

1. حسن نعیم کی غزل گوئی کی خصوصیات مختصراً بیان کیجئے۔
2. ان اشعار کی تشریح کیجئے:

قلب و جاں میں حسن کی گہرائیاں رہ جائیں گی
تو وہ سورج ہے تیری پرچھائیاں رہ جائیں گی

فسانہ غم کا کوئی غم گسار ہو تو کہیں
کہانی دل کی کوئی دل فگار ہو تو کہیں

طویل سوالات

1. حسن نعیم کی غزلوں کا عام رنگ کیا ہے؟
2. حسن نعیم کی کن بزرگ شعراء نے حوصلہ افزائی کی؟
3. حسن نعیم کن شعراء سے خاص طور پر متاثر تھے؟
4. حسن نعیم کو جدید شاعروں میں کیوں انفرادیت حاصل ہے؟

آیئے، کچھ کریں

1. حسن نعیم کی کسی ایک پسندیدہ غزل کو زبانی یاد کیجئے۔
2. حسن نعیم کی غزل گوئی کے بارے میں اپنے دوستوں کے ساتھ تبادلۂ خیال کیجئے۔

پروین شاکر

پروین شاکر 24 نومبر 1952ء کو کراچی (پاکستان) میں پیدا ہوئیں۔ ویسے ان کے اسلاف کا وطن ہندوستان کے لہیریا سرائے، دربھنگہ (بہار) میں تھا۔ ان کے والد سید ثاقب حسین خود بھی شاعر تھے اور شاکر تخلص کرتے تھے۔ اسی نسبت سے پروین اپنے نام کے ساتھ شاکر لکھتی تھیں۔ ہندوستان کے بٹوارے کے بعد ان کے والد پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔

پروین شاکر کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ اس کے بعد رضیہ گرلس ہائی اسکول میں ان کا داخلہ ہوا۔ جہاں سے انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ بی اے کی ڈگری انہوں نے سرسید گرلس کالج سے حاصل کی۔ کراچی یونی ورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ پھر لسانیات میں بھی ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور دونوں ہی امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ 1971ء میں انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔ ان کے تحقیقی مقالے کا عنوان 'جنگ میں ذرائع وابلاغ کا کردار' تھا۔ لیکن ان کا تعلیمی سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ وہ ہارورڈ یونی ورسٹی، امریکہ سے وابستہ ہوگئیں جہاں سے انہوں نے بینک ایڈمنسٹریشن میں ایم اے کیا۔ تعلیمی سلسلہ ختم ہوا تو پروین شاکر نے عبداللہ گرلس کالج میں انگریزی لکچرر کی حیثیت سے ملازمت کر لی اور تقریباً 9 برسوں تک درس وتدریس کی خدمات انجام دیتی رہیں۔ اس کے بعد انہوں نے سول سروس کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئیں۔ اس کے بعد ان کا تقرر محکمہ کسٹمز میں ہوگیا اور وہ کسٹم کلکٹر ہوگئیں۔ اس عہدے سے ترقی کرتے ہوئے پرنسپل سکریٹری پھر سی بی آر اسلام آباد میں مقرر ہوئیں۔

پروین شاکر کی شادی اپنے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر نصیر علی سے ہوئی لیکن یہ رشتہ جلد ہی ٹوٹ گیا۔ دراصل دونوں کے مزاج میں کافی فرق تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ المیہ ذہنی عدم توازن کی وجہ سے ہی پیدا ہوا۔ ان سے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا جس کا نام سید مراد علی رکھا گیا۔

بہرحال، 1989ء میں پروین شاکر طلاق لے کر شوہر سے آزاد ہوگئیں۔ انہوں نے 42 برس کی عمر پائی جس میں 27 برسوں تک شاعری کی۔ انہوں نے پندرہ برس کی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی۔

پروین شاکر بے حد نرم دل خاتون تھیں۔ ان کے اندر ہمدردی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ مہذب، حساس اور بے حد ذہین بھی تھیں۔ ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ انہیں نسائی تحریک سے وابستہ کیا جاسکتا ہے کیوں کہ ان کی شاعری میں عورتوں کے جذبات بہت ہی شدت کے ساتھ اور فطری انداز میں ابھرے ہیں۔

پروین شاکر کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ 1977ء میں ان کا پہلا مجموعہ کلام 'خوشبو' سامنے آیا۔ اس کے بعد 1981ء میں 'صد برگ'، 1984ء میں 'خود کلامی'، 1990ء میں 'انکار' اس کے بعد 'ماہ تمام' کے نام سے کلیات بھی شائع ہوا۔ 'کف آئینہ' کے نام سے ایک اور مجموعہ کلام شائع ہوا۔

پروین شاکر کی وفات 26 دسمبر 1994ء کو اسلام آباد کے نزدیک ایک سڑک حادثے میں ہوئی۔ لیکن نسائی تحریک کی یہ شاعرہ اپنے کلام میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گی۔

پروین شاکر

(۱)

گئے موسم میں جو کھلتے تھے گلابوں کی طرح
دل پہ اتریں گے وہی خواب عذابوں کی طرح

راکھ کے ڈھیر پہ اب رات بسر کرنی ہے
جل چکے ہیں مرے خیمے، مرے خوابوں کی طرح

ساعتِ دید کے عارض ہیں گلابی اب تک
اولیں لمحوں کے گلنار حجابوں کی طرح

غیر ممکن ہے ترے گھر کے گلابوں کا شمار
میرے رِستے ہوئے زخموں کے حسابوں کی طرح

یاد تو ہوں گی وہ باتیں تجھے اب بھی لیکن
شیلف میں رکھی ہوئی بند کتابوں کی طرح

کون جانے کہ نئے سال میں تو کس کو پڑھے
تیرا معیار بدلتا ہے نصابوں کی طرح

شوخ ہو جاتی ہے اب بھی تری آنکھوں کی چمک
گاہے گاہے، ترے دلچسپ جوابوں کی طرح

ہجر کی شب، مری تنہائی پہ دستک دے گی
تیری خوشبو، مرے کھوئے ہوئے خوابوں کی طرح

(۲)

بارش ہوئی تو پھولوں کے تن چاک ہو گئے
موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفاک ہو گئے

بادل کو کیا خبر ہے کہ بارش کی چاہ میں
کیسے بلند و بالا شجر خاک ہو گئے

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

لہرا رہی ہے برف کی چادر ہٹا کے گھاس
سورج کی شہ پہ تنکے بھی بے باک ہو گئے

بستی میں جتنے آب گزیدہ تھے سب کے سب
دریا کے رخ بدلتے ہی تیراک ہو گئے

سورج دماغ لوگ بھی ابلاغِ فکر میں
زلفِ شبِ فراق کے پیچاک ہو گئے

جب بھی غریبِ شہر سے کچھ گفتگو ہوئی
لہجے ہوائے شام کے نمناک ہو گئے

لفظ و معنی

عذاب - سزا، کسی گناہ کی سزا

بسر کرنا - گزارنا، بِتانا

ساعت - لمحہ

دید - دیکھنا

عارض - رخسار، گال

اولیں - پہلا، سب سے پہلا

گلنار - انار کا پھول، لال پھول

حجاب - پردہ

شاداب - تروتازہ

غیر ممکن - ناممکن، نہ ہونے والا

تشنگی - پیاس

سراب - دھوکا، ریگستان میں جو ریت چمکتی ہے، وہ چمک دور سے پانی کے چشمے کی طرح دکھائی دیتی ہے یعنی اس پر پانی کا گمان یا دھوکا ہوتا ہے۔ اسی کو سراب کہتے ہیں۔

شمار - گنتی

شیلف - الماری

معیار - انداز

شوخ - چنچل

گاہے گاہے - کبھی کبھی

ہجر - جدائی

شب - رات

خوش بو - اچھی مہک

تن - بدن، جسم

سفاک	۔	بے درد، بے رحم
خبر	۔	پتہ، علم
چاہ	۔	چاہت، طلب، خواہش
بلند و بالا	۔	اونچا
شجر	۔	درخت
ضد	۔	اصرار
شہ	۔	اشارہ
بے باک	۔	بے جھجک
آب گزیدہ	۔	پانی کا مارا ہوا، کاٹا ہوا
تیراک	۔	تیرنے والا
سورج دماغ	۔	روشن دماغ
ابلاغ	۔	پہنچانا، منتقل کرنا، اپنی بات یا خیال کو دوسروں تک پہنچانا
ابلاغِ فکر	۔	اپنی فکر کو دوسروں تک پہنچانا
پیچاک	۔	گرہ، الجھن
زلف	۔	لمبے بال، گیسو
غریبِ شہر	۔	پردیسی
فراق	۔	جدائی، ہجر

آپ نے پڑھا

- آپ نے شاملِ نصاب پروین شاکر کی دو غزلوں کا مطالعہ کیا جن میں پہلی غزل آٹھ اور دوسری غزل نو اشعار پر مشتمل ہے جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ پروین شاکر کی شاعری میں عورتوں کے جذبات، بہت ہی شدت کے ساتھ اور فطری انداز میں پیش ہوئے ہیں، ان دونوں غزلوں کے مطالعہ سے ان خیالات کو تقویت مل جاتی ہے۔ عشق و محبت کے حوالے سے ان غزلوں میں جن جذبات و احساسات کی ترجمانی کی گئی ہے ان میں درد، کسک، ٹیس اور کرب کو بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان میں ذرا بھی تصنع نہیں بلکہ یہ شاعرہ کے اپنے دل کی حقیقی اور فطری آواز معلوم

ہوتی ہے جس سے بخوبی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پروین شاکر کی شاعری دراصل ان کی ناکام محبت کی ترجمانی کا دوسرا نام ہے۔ ایک اور خاص بات جو پروین شاکر کی ان غزلوں کے مطالعہ سے اجاگر ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ پروین شاکر اپنے جذبات واحساسات کو، حسرت و ہیجان کو، ہجر وانتظار کو اور محبوب کی بے وفائی اور بے مروتی کو کچھ اس انداز سے شعری پیکر عطا کرتی ہیں کہ ایک طرف جہاں ان کی شاعری اپنے جذبات کی کہانی معلوم ہوتی ہے وہیں دوسری طرف انہیں کی طرح محبت کی ماری دوسری خواتین کی دلی کیفیات کی ترجمانی نظر آتی ہے۔ اس طرح پروین شاکر ایسی ہی عورتوں کی ایک نمائندہ شاعرہ کے طور پر ابھر کر منظر عام پر آئی ہیں۔ ایسی نمائندہ جو محبت میں ناکام ہونے کے باوجود، زندگی سے راہ فرار اختیار نہیں کرتیں بلکہ نرم اور مدھم نسوانی لہجہ کے باوجود نسوانی تحریک کی مضبوط علمبرداری کرتی ہیں۔

مختصر ترین سوالات

1. پروین شاکر کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟
2. پروین شاکر کہاں پیدا ہوئیں؟
3. پروین شاکر کے اسلاف کا وطن کہاں ہے؟
4. پروین شاکر کے والد کا نام بتایئے۔
5. پروین شاکر کے والد ہجرت کر کے کہاں گئے؟
6. پروین شاکر کی ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی؟
7. پروین شاکر نے میٹرک کا امتحان کس اسکول سے پاس کیا؟
8. بی اے کی تعلیم پروین شاکر نے کس کالج میں حاصل کی؟
9. کراچی یونی ورسٹی سے انہوں نے کس کس سبجکٹ میں ایم اے کیا؟
10. ہارورڈ یونی ورسٹی، امریکہ سے پروین شاکر نے کس سبجکٹ میں ایم اے کیا؟

مختصر سوالات

1. پروین شاکر کی سوانح پر پانچ جملے لکھئے۔
2. اپنی یاد سے پروین شاکر کا کوئی ایک شعر لکھئے۔

3. پروین شاکر کی ازدواجی زندگی مختصراً بیان کیجیے۔

4. پروین شاکر کی شاعری پر پانچ جملے لکھیے۔

طویل سوالات

1. پروین شاکر کا تفصیلی تعارف پیش کیجیے۔

2. پروین شاکر کی شاعری میں کس طرح کے جذبات شدت کے ساتھ ابھرے ہیں؟

3. نصاب میں شامل پروین شاکر کی کسی ایک غزل کے ادبی محاسن پر روشنی ڈالیے۔

4. راکھ کے ڈھیر پہ اب رات بسر کرنی ہے   جل چکے ہیں مرے خیمے مرے خوابوں کی طرح

اس حزنیہ شعر کی تشریح کیجیے۔

آئیے، کچھ کریں

1. پروین شاکر کے شعری مجموعوں کی ایک فہرست تیار کیجیے۔

2. اپنے استاد سے کچھ اور شاعرات کے نام دریافت کیجیے۔

عرفان صدیقی

عرفان صدیقی کا اصل نام عرفان احمد صدیقی تھا لیکن وہ عرفان صدیقی کے نام سے شعروادب کی دنیا میں مشہور ہوئے۔ 8 / جنوری 1939ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ وہ شیخ صدیقی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد مولوی سلمان احمد صدیقی ہلالی بدایونی تھے۔ جن کا انتقال 1981ء میں ہوا۔ عرفان صدیقی نے بدایوں کے محلہ سوتھا میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے اور اردو کے ادیب اور شاعر بھی۔ اس طرح عرفان صدیقی کو ایک علمی ادبی ماحول ملا۔ ان کے یہاں تین نسلوں سے شعروادب کی آبیاری ہورہی تھی۔ ان کے دادا مولوی اکرام احمد شاد صدیقی اپنے وقت کے سرسید سمجھے جاتے تھے اور وہ شاعر بھی تھے۔ عرفان صدیقی کے بھائی نیاز صدیقی بھی شاعر تھے لیکن عرفان صدیقی جیسی شہرت ومقبولیت انہیں حاصل نہ ہوسکی۔

عرفان صدیقی نے 1953ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد 1955 میں انٹرمیڈیٹ، 1957ء میں بی اے اور 1959ء میں ایم اے کیا۔ ایم اے میں ان کا موضوع عمرانیات تھا۔ انہوں نے دہلی سے ماس کمیونی کیشن میں ڈپلوما حاصل کیا اور 1962ء میں حکومت ہند کی اطلاعاتی سروس سے وابستہ ہوگئے۔ پھر وہ مختلف شعبے میں کام کرتے رہے۔ آخر میں نائب پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے اور یہیں سے سبکدوش بھی ہوئے۔ سبکدوشی کے بعد انہوں نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کرلی۔ 16 / مارچ 2004ء کو برین ٹیومر کے مرض کی وجہ سے ان کا انتقال ہوگیا۔

عرفان صدیقی کے کئی مجموعے شائع ہوئے جواب یکجا طور پر 'دریا' کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔ انہوں نے کالی داس کے سنسکرت ڈراما 'مالویکا اگنی مترم' کا 'مالویکا اور اگنی متر' کے عنوان سے ترجمہ کیا تھا۔ رابطۂ عامہ کے موضوع پر بھی انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے۔

عرفان صدیقی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے پرانے اور نئے شاعروں کے بھی اثرات قبول کیے اور ان اثرات نے ان کی غزلوں کو ایک نیا رنگ اور نیا آہنگ عطا کردیا۔ اور یہی وہ چیز ہے جس سے وہ اپنے معاصرین میں منفرد غزل گو تسلیم کیے جاتے ہیں۔

عرفان صدیقی

(۱)

دستِ عصائے معجزہ گر بھی اسی کا ہے	گہرے سمندروں میں سفر بھی اسی کا ہے
تیرا یقین سچ ہے مری چشمِ اعتبار	سب کچھ فصیلِ شب کے ادھر بھی اسی کا ہے
بس اپنا اپنا فرض ادا کررہے ہیں لوگ	ورنہ سناں بھی اس کی ہے سر بھی اسی کا ہے
تیغِ ستم کو جس نے عطا کی ہیں مہلتیں	فریادِ کشتگاں میں اثر بھی اسی کا ہے
منظر میں جتنے رنگ ہیں نیرنگ اسی کے ہیں	حیرانیوں میں ذوقِ نظر بھی اسی کا ہے
مجرم ہوں اور خرابۂ جاں میں اماں نہیں	اب میں کہاں چھپوں کہ یہ گھر بھی اسی کا ہے

خود کو چراغِ راہ گزر جانتا ہوں میں
لیکن چراغِ راہ گزر بھی اسی کا ہے

کام اس شکوۂ تنہائی سے کیا چلتا ہے	تو اکیلا ہے کہ دنیا سے جدا چلتا ہے
رنگ آسان ہیں پہچان لئے جاتے ہیں	دیکھنے سے کہیں خوشبو کا پتہ چلتا ہے
لہر اٹھے کوئی دل میں تو کنارے لگ جائیں	یہ سمندر ہے یہاں حکمِ ہوا چلتا ہے
پاؤں میں خاک کی زنجیر پڑی ہے کب سے	ہم کہاں چلتے ہیں نقشِ کفِ پا چلتا ہے
شہر در شہر رواں ہے مری فریاد کی گونج	مجھ سے آگے مرا رہوارِ صدا چلتا ہے

اس خرابے میں بھی ہوجائے گی دنیا آباد
ایک معمورہ پسِ سیلِ بلا چلتا ہے

لفظ و معنی

دست	-	ہاتھ
عصا	-	لاٹھی
معجزہ	-	حیرت انگیز واقعہ
معجزہ گر	-	معجزہ کرنے والا
چشم	-	آنکھ
اعتبار	-	بھروسہ
فصیل	-	دیوار
شب	-	رات
سناں	-	برچھی
تیغ	-	تلوار
ستم	-	ظلم
مہلت	-	فرصت
کشتگاں	-	قتل کیے ہوئے لوگ، مقتول
نیرنگ	-	بہت سے رنگ
ذوق نظر	-	دیکھنے کی چاہت، دیکھنے کا شوق
مجرم	-	جرم کرنے والا، قصوروار
خرابہ	-	ویرانہ، ویران جگہ، غیر آباد جگہ
خرابہ جاں	-	ویران زندگی
اماں	-	امن، سکون
شکوہ	-	شکایت
جدا	-	الگ
لہر	-	موج، دھارا

ABDIEL SOLUTION ABSOL PATNA

خاک	۔	مٹی
زنجیر	۔	بیڑی
پا	۔	پیر، پاؤں
کفِ پا	۔	پاؤں کا تلوا
رواں	۔	چلتا ہوا، چلتی ہوئی
فریاد	۔	دہائی
رہوار	۔	چلنے والا، مسافر
صدا	۔	آواز
معمورہ	۔	بھیڑ، جماعت، گروہ
پس	۔	پیچھے
سیلِ بلا	۔	بلاؤں کا طوفان، مصیبتوں کا طوفان

آپ نے پڑھا

- آپ نے عرفان صدیقی کی دو غزلیں پڑھیں۔ عرفان صدیقی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے پرانے اور نئے شاعروں کے اثرات قبول کئے ہیں۔ اور ان اثرات نے ان کی غزلوں کو ایک نیا رنگ اور نیا آہنگ یا ایک نیا ذائقہ عطا کر دیا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس سے وہ اپنے معاصرین میں منفرد غزل گو تسلیم کئے جاتے ہیں۔

مختصر گفتگو

1. عرفان صدیقی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(الف) 1939 بدایوں (ب) 1938 لکھنؤ (ج) 1937 سہسرام (د) 1940 علی گڑھ

2. عرفان صدیقی کا تعلق کس خاندان سے تھا؟

(الف) شیخ صدیقی (ب) سید شیخ (ج) صدیقی خاندان (د) بدایوں خاندان

3. عرفان صدیقی نے میٹرک کا امتحان کب پاس کیا؟

(الف) 1955 (ب) 1953 (ج) 1954 (د) 1956

4. مولوی اکرام احمد شاد صدیقی اپنے عہد کے سرسید سمجھے جاتے تھے؟ یہ عرفان صدیقی کے کون تھے؟

(الف) دادا (ب) چاچا (ج) ماموں (د) والد

5. عرفان صدیقی نے ماس کمیونی کیشن میں ڈپلوما کہاں سے حاصل کیا؟

(الف) کلکتہ (ب) دہلی (ج) لکھنو (د) بدایوں

مختصر ترین سوالات

1. عرفان صدیقی کا انتقال کس مرض کی وجہ سے ہوا؟
2. عرفان صدیقی کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟
3. عرفان صدیقی کے مجموعے کس نام سے یکجا طور پر شائع ہوئے؟
4. عرفان صدیقی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کہاں سکونت پذیر ہوئے؟
5. عرفان صدیقی نے کالی داس کے ڈراما 'مالویکا اگنی مترم' کا ترجمہ کس نام سے کیا؟

طویل سوالات

1. عرفان صدیقی کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔
2. دوسری غزل کے دوسرے شعر کی تشریح کیجیے۔
3. پہلی غزل کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔
4. درج ذیل شعر کی تشریح کیجیے:

اس خرابے میں بھی ہو جائے گی دنیا آباد
ایک معمورہ پسِ سیل بلا چلتا ہے

4. عرفان صدیقی کے حالات زندگی بیان کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے عرفان صدیقی کے بارے میں مزید معلومات فراہم کیجیے۔
2. اپنے اسکول یا علاقے کی لائبریری میں عرفان صدیقی کی شاعری کے مجموعے تلاش کر کے ان کا مطالعہ کیجیے۔

دوہا

دوہا ہندی زبان کی ایک قدیم صنف سخن ہے۔ قدیم فارسی رباعی کی طرح دوہے کے موضوعات بھی عام طور سے پند و نصائح اور مذہب و اخلاق سے جڑے تھے ہی تھے دوہے کی زبان بھی بہت عام فہم اور سہل ہوتی تھی، جسے ہاٹ بازار، گلی کوچے میں چلنے پھرنے والا ہر ادنیٰ و اعلیٰ آدمی سمجھ سکے۔ حال کے دنوں میں اردو دوہوں میں موضوعات نے بہت وسعت اور تنوع اختیار کر لیا ہے۔ اس میں ہر طرح کے موضوعات شامل کیے جا رہے ہیں۔

دوہے میں دو مصرعے ہوتے ہیں ہر مصرعے میں ایک وقفہ ہوتا ہے یعنی ہر مصرعے میں دو چرن ہوتے ہیں وقفے سے پہلے کا حصہ سم چرن اور بعد کا حصہ وشم چرن کہلاتا ہے۔ سم چرن میں تیرہ اور وشم چرن میں گیارہ ماترائیں ہوتی ہیں۔ عموماً دوہے میں ردیف نہیں ہوتی لیکن ہو تو عیب نہیں، بلکہ ایک حسن اضافی ہے۔

ظفر گورکھپوری

ہم عصر اردو شعر و ادب میں ظفر گورکھپوری کا نام انتہائی ادب و احترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف کامیاب شاعر ہیں۔ بلکہ انہوں نے کئی فلمی نغمے بھی لکھے ہیں۔

ظفر گورکھپوری کی پیدائش 5 رمئی 1935 کو اتر پردیش کے گورکھپور واقع بانس گاؤں تحصیل کے بیدولی بابو گاؤں میں ہوئی۔ کم عمری میں ہی انہوں نے غزل کے شعبہ میں قابل ذکر مقام بنالیا تھا۔

ظفر گورکھپوری کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت کلاسیکل شاعری اور جدید شاعری کے ساتھ کیے گئے ان کے تجربے کا خوبصورت میلان ہے۔ ان کی شاعری میں بالکل نیا اسلوب اور فکر و احساسات کی نئی تازگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی شاعری فراق گورکھپوری کے ساتھ شروع ہوتی ہے اور علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر سے ہوتی ہوئی آج تک پہنچتی ہے۔

ظفر گورکھپوری کی شاعری کے اب تک سات مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے نام ہیں — تیشہ، وادیٔ سنگ، گوکھرو کے پھول، چراغ چشم تر، آر پار کا منظر، زمین کے قریب اور ہلکی ٹھنڈی ہوا۔ اس کے علاوہ بچوں کے لئے بھی ان کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے نام ہیں — ناچ ری گڑیا، اور سچائیاں۔

'زمین کے قریب' میں نظموں، غزلوں اور گیتوں کے ساتھ ساتھ کافی تعداد میں دوہے بھی شامل ہیں۔

ظفر گورکھپوری نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے دورے کیے ہیں اور عالمی مشاعروں میں ہندوستان کی نمائندگی کی ہے۔

دوہے

تارے چھو، جگنو پکڑ، رچ سپنوں کے کھیل
رات کی اتنی عمر ہے، دیئے میں جتنا تیل

جس پردے میں جھانکئے، بس اک تیرا روپ
کیا بادل میں بوندیاں کیا سورج میں دھوپ

حد سے ادھک سنجیدگی، سچ پوچھو تو روگ
آگا پیچھا سوچتے بوڑھے ہوگئے لوگ

بھوکی بھیڑ کے جسم میں بس
چرواہے کو دودھ دے یا تاجر کو اون

جا کر بیٹھیں چار پل، کن پیڑوں کے پاس
ظفر ہمارے بھاگ میں شہروں کا بن باس

لے آئے بازار سے سکھ کے لمحے چند
پیسوں سے ملتا کہیں جو من کا آنند

اس سے بڑھ کر اور کیا رشتوں کی پہچان
گرے کھلاڑی پیڑ پر اور میں لہولہان

رات پرائے دیس کی، ہر سپنا برباد
جگنو سا چمکا کرے ماں کا آشرواد

بچے ٹی وی دیکھ کر خوش تو ہوئے جناب
دکھ لیکن اس بات کا، بیوہ ہوئی کتاب

کیا چنتن کیا چیتنا، بھور اپنی نہ سانجھ
کمپیوٹر کے کال میں سب بنجر سب بانجھ

لفظ و معنی

روپ ۔ شکل
روگ ۔ مرض، بیماری
تاجر ۔ تجارت کرنے والا
آنند ۔ خوشی، مسرت
سپنا ۔ خواب
بیوہ ۔ وہ عورت، جس کا شوہر کا انتقال ہو گیا ہو
چنتن ۔ فکر، کسی بات پر غور کرنا، سوچنا
چیتنا ۔ شعور، سمجھ
کال ۔ زمانہ، عہد
بنجر ۔ غیر اپجاؤ

بھور	۔	صبح سویرے، علی الصبح
سانجھ	۔	شام
بانجھ	۔	جس عورت کو اولاد نہ ہو
ہم عصر	۔	اپنے زمانے کا
انتہائی	۔	بہت، بے انتہا
احترام	۔	عزت
شعبہ	۔	میدان، شاخ
قابلِ ذکر	۔	ذکر کرنے لائق، خاص
خصوصیت	۔	خاصیت، خوبی
کلاسیکل	۔	اعلیٰ درجہ کی پرانی / پرانا
جدید	۔	نیا / نئی
میلان	۔	ملن، ایک جگہ ملنا
اسلوب	۔	ڈھنگ، طریقہ، اسٹائل
عالمی	۔	پوری دنیا کی سطح پر
نمائندگی	۔	قیادت / اگوائی کرنا، نمائندہ بن کر جانا
قدیم	۔	پرانا / پرانی
صنف	۔	قسم
سخن	۔	کلام
پند	۔	نصیحت، بھلی بات، ہدایت
نصائح	۔	نصیحت کی جمع
اخلاق	۔	عادتیں، برتاو
عام فہم	۔	عام لوگوں کی سمجھ میں آنے والا
سہل	۔	آسان

ادنیٰ - چھوٹا، معمولی

اعلیٰ - بڑا، بلند مرتبہ

وسعت - پھیلاو

تنوع - قسم قسم کا ہونا

وقفہ - ٹھہراو

عموماً - عام طور سے

آپ نے پڑھا

- ظفر گورکھپوری ہندوستان کے بزرگ شاعروں میں ایک ہیں۔ان کی شہرت پوری اردو ادبی دنیا میں ہے اور ان کا نام انتہائی عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ انہوں نے غزلیں، نظمیں اور فلمی نغمے لکھے ہیں۔ ساتھ ہی دوہے بھی لکھے ہیں۔ بچوں کے لئے بھی انہوں نے کئی نظمیں لکھی ہیں۔
- ظفر گورکھپوری کے دوہے انتہائی سیدھے سادے الفاظ والے اور آسانی سے سمجھ میں آجانے والے ہوتے ہیں۔ ان کے دوہوں کا تعلق سیدھے سیدھے ہماری زندگی سے ہوتا ہے۔
- پہلے دوہے میں کہا گیا ہے کہ رات کی عمر بہت لمبی نہیں ہوتی ہے۔اس کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے۔ اتنی ہی، جتنا کہ کسی دیئے میں تیل ہوتا ہے۔ رات کے اس لمحہ کو خواب بننے اور تفریح میں بتانا چاہئے۔ جب کہ تیسرے دوہے میں کہا گیا ہے کہ بہت زیادہ سنجیدگی بھی ٹھیک نہیں ہے، یہ ایک طرح کا مرض ہے۔ بہت سے لوگ سوچتے سوچتے ہی بوڑھے ہوگئے۔
- دوسرے دوہے میں اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کی گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ قدرت کی ہر شئے میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔اس دوہے میں شاعر اسی بات کو بادل اور سورج کے حوالے سے کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بادل کی بوندوں میں اور سورج کی دھوپ میں قدرت کی کارفرمائی ہے۔
- چوتھے دوہے میں انسان کی تنگ دستی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بھوکی بھیڑ کی مثال پیش کی گئی ہے۔ شاعر کہہ رہا ہے کہ بھوکی بھیڑ کے جسم میں تو تھوڑا سا خون ہی ہے۔ وہ چرواہے کو دودھ کہاں سے دے پائے گی۔ البتہ تاجر چاہے تو اس سے اون حاصل کرسکتا ہے کیوں کہ وہی چیز اس کے جسم پر مل جائے گی۔
- پانچویں دوہے میں شہر کی بھیڑ بھاڑ، چیخ و پکار اور بے چینی ظاہر کی گئی ہے جہاں چین سے چار پل بھی نصیب نہیں

ہوتا ہے جو اطمینان اور سکون کسی شانت جگہ پر کسی پیڑ کے سائے تلے ملتا ہے وہ کہیں اور کہاں؟ شہر میں جینا تو بن باس جیسا ہوتا ہے۔

- چھٹے دوہے میں شاعر کہتا ہے کہ پیسے سے سب کچھ خریدا جاسکتا ہے، لیکن زندگی کا حقیقی لطف حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ بازار میں جو چاہیں خرید لیں، مگر سکھ اور چین نہیں مل سکتے۔
- ساتویں دوہے میں شاعر نے بہت بڑی بات کہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ اتنا گہرا رشتہ ہونا چاہئے کہ اگر ایک کو کوئی تکلیف، پریشانی ہو تو دوسرے کو اس کا احساس ہو جائے اور وہ پریشانی میں مبتلا شخص کی مدد کو آگے آئے۔ شاعر نے اسی کو پیڑ پر کلہاڑی چلانے کے عمل سے بتانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے گہرا رشتہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ کوئی پیڑ پر کلہاڑی چلائے تو لگے کہ میں ہی لہولہان ہو رہا ہوں۔
- آٹھویں دوہے میں ماں اور مادر وطن کی عظمت اور اہمیت بیان کی گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ پرایا دیس آخر پرایا ہی ہوتا ہے۔ وہاں کوئی اچھا سا خواب نہیں دیکھا جاسکتا۔ دوسری طرف ماں کے بارے میں کہتا ہے کہ ماں کی دعاؤں سے آشیر واد سے انسان کی قسمت روشن ہوتی ہے۔
- نویں دوہے میں بچوں کی ٹی وی دیکھنے کی بڑھتی ہوئی عادت پر افسوس ظاہر کیا گیا ہے۔ شاعر کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس عادت سے بچے کتابیں پڑھنے پر کم وقت دیتے، جس سے کتابیں یوں ہی پڑی رہتی ہیں اور انہیں کوئی پڑھنے والا نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح دسویں دوہے میں کمپیوٹر کی لت پر تشویش ظاہر کی گئی ہے۔ شاعر کی نظر میں کمپیوٹر نے آدمی کی سوچنے اور غور وفکر کی صلاحیت کو چھین لیا ہے۔ آدمی اپنے ذہن کا استعمال اب کم سے کم کرتا جارہا ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. ظفر گورکھپوری کی پیدائش کب ہوئی؟
2. ظفر گورکھپوری کی پیدائش کس ریاست میں ہوئی؟
3. ظفر گورکھپوری کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے؟
4. بچوں کے لئے ظفر گورکھپوری کے کون سے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں؟
5. ظفر گورکھپوری نے کن کن ملکوں کا دورہ کیا؟

مختصر سوالات

1. ظفر گورکھپوری کا کون سا دوہا آپ کو سب سے زیادہ اچھا لگا اور کیوں؟
2. پانچویں دوہے میں 'شہروں کی بن باس' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
3. پیڑ پر کلہاڑی گرنے سے شاعر کس طرح لہولہان ہوا؟
4. بچوں کے ٹی وی زیادہ دیکھنے پر شاعر کیوں دکھی ہے؟
5. کمپیوٹر سے کیا نقصان پہنچ رہا ہے؟

طویل سوالات

1. شاعر نے اپنے دوہوں میں کن کن خیالات کا اظہار کیا ہے؟ ان کی فہرست بنائیے۔
2. ظفر گورکھپوری کے دوہوں کی خوبیوں کو واضح کیجئے۔
3. ظفر گورکھپوری کے متعلق اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے۔

ذرا غور کریں:

دوہا دراصل ہندی زبان کی ایک صنف ہے۔ بعد کے دنوں میں یہ اردو زبان میں بھی لکھا جانے لگا۔ دوہے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی زبان بہت آسان ہوتی ہے تاکہ عام لوگ فوراً سمجھ جائیں۔ یہاں تک کہ ان پڑھ لوگوں کو بھی سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو، بلکہ ان کی زبان پر چڑھ جائے۔ کبیر کے دوہوں کی بھی یہی خصوصیت تھی۔ ان کے کئی دوہے کافی مشہور ہیں۔

آیئے، کچھ کریں

1. فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ کے لئے ظفر گورکھپوری کی شاعری کے نمونے جمع کیجئے۔
2. کبیر کے چند دوہے جمع کرکے ان کی خوبیاں تفصیل سے لکھئے۔

گیت

جس طرح غزل اردو شاعری کی بہت ہی مقبول صنف ہے، اسی طرح ہندی کی شعری اصناف میں گیت کی صنف قدیم زمانے سے مقبول ہے۔ اردو زبان نے جہاں فارسی اور انگریزی کے اثرات قبول کرتے ہوئے فارسی، انگریزی اور دوسری غیر ملکی زبانوں کی صنفوں کو اردو زبان میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اس طرح شروع ہی سے یہ ہندی کے اثرات قبول کرتی رہی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اردو میں گیت نگاری کی روایت نہ صرف قائم ہو چکی ہے بلکہ یہ ارتقا پذیر بھی ہے۔

گیت ہندی شاعری کی بہت ہی قدیم اور محبوب صنف ہے اور اردو میں ہندی مزاج کی نمائندگی کرنے والی یہ صنف بہت پہلے سے رائج ہے۔ قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک کئی شاعروں کے یہاں اس کے نمونے ملتے ہیں۔ یہ دراصل دیہات کے عوام کی معصوم اور پاک دھڑکنوں کی ترجمانی ہے۔ کھیت کھلیان پر جاتے وقت مزدور کسان گنگناتے ہوئے اپنے دلوں کو تازگی بخشنے کے لئے، شادی بیاہ میں رسموں کی ادائیگی کے وقت، لڑکیوں کی رخصتی کے موقع پر جو نغمے گائے جاتے ہیں، وہ گیت ہے۔ اس لئے گیت جذبات کی سچی عکاسی کرتا ہے اور اس میں نغمگی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

گیت کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہندی کے نرم و نازک اور سبک رو الفاظ کا ہی استعمال زیادہ ہوتا ہے جس سے گیت میں کافی مٹھاس پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی حلاوت دل چھو لیتی ہے۔ بناوٹ کے اعتبار سے گیت کی ایک خاص اور منفرد شناخت ہے۔ عہد حاضر میں اس صنف کو بخوبی برتنے والے شاعروں میں سلام مچھلی شہری، بیکل اتساہی، اجمل سلطان پوری، زبیر رضوی اور وسیم بریلوی کے نام قابل ذکر ہی نہیں بلکہ قابلِ فخر ہیں۔

سلام مچھلی شہری

سلام مچھلی شہری کا اصل نام عبدالسلام تھا۔ مچھلی شہر جونپور (یوپی) کا ایک قصبہ ہے جہاں وہ یکم جولائی 192ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبدالرزاق تھا اور دادا محمد اسمٰعیل تھے۔ والد کی مالی حالت اچھی نہیں تھی اس لئے سلام مچھلی شہری کسی طرح فیض آباد کے فاربس ہائی اسکول میں داخل ہوئے اور ایک مخلص اللہ قاسم کے بچوں کو پڑھانے لگے۔ فیض آباد میں قیام کے دوران ہی سلام مچھلی شہری سیاست میں دلچسپی لینے لگے جس کے نتیجے میں تحریک آزادی ہند سے بھی وابستہ ہوگئے۔ اسی زمانے میں ان کی شاعری کی بھی ابتدا ہوئی اور وہ تحریک آزادی کے پس منظر میں انقلاب آفریں نظمیں لکھنے لگے۔ سیاست کی وجہ سے ان کی تعلیم بھی متاثر ہوئی۔ میٹرک کے امتحان میں ناکام ہوگئے۔ پھر میٹرک کے مساوی کوئی امتحان پاس کرکے لکھنؤ یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ لیکن وہاں بھی جلد ہی ان کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا۔ مگر دوسری طرف ان کی تحریکی شاعری زور پکڑنے لگی۔ اسی دوران انہوں نے انقلابی نظموں کا ایک مجموعہ 'میرے نغمے' شائع کیا، جسے برطانوی حکومت نے ضبط کرلیا۔ سلام مچھلی شہری کو منظوم خط لکھنے کی بھی عادت تھی چنانچہ اپنے وقت کے اہم لوگوں کو وہ ایسے خطوط لکھا کرتے تھے۔ خطوط کے سلسلہ میں آچاریہ نریندر سے ان کا رابطہ ہوا اور وہ فیض آباد کے ایک رسالہ 'نغمہ' کے ایڈیٹر ہوئے۔

سلام مچھلی شہری نے اس وقت شاعری شروع کی جب ان کی عمر چودہ سال تھی یعنی 1935ء کے آس پاس ان کی پہلی نظم 'نیرنگ خیال' میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ہی وہ ترقی پسند تحریک سے ذہنی طور پر متاثر ہوئے۔ لیکن سلام اپنے طور پر بھی کچھ ایسی شاعری کرنا چاہتے تھے کہ اس میں نیرنگی ہو۔ چنانچہ انہوں نے بعض ہیئتی تجربے بھی کئے۔ گیتوں کے مجموعے جیسے 'پایل'، 'بازو بند کھل جائے' اور 'تین ہیرے' اپنے وقت میں بہت مقبول تھے۔ لیکن بنیادی طور پر سلام ترقی پسند ہی رہے۔ ان کی بعض نظمیں اب بھی یاد کی جاتی ہیں۔ ایسی نظموں میں 'سڑک بن رہی ہے' اور 'پیتل کا سانپ' وغیرہ قابلِ ذکر ہے۔ ان نظموں میں زندگی کے تجربات سادہ ہیں لیکن طرز فکر میں انفرادیت ہے۔ 1944ء میں سلام کا دوسرا مجموعہ 'وسعتیں' شائع ہوا جس میں کچھ نئی اور کچھ پرانی نظمیں ہیں۔

سلام مچھلی شہری نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ لیکن ان کی غزلوں میں وہی انقلاب کی لے ہے اور یہ لے کبھی کبھی غربت و افلاس کی دنیا میں انہیں لے جاتی ہے اور یہ دنیا روز اول سے ہی ایک نمایاں موضوع بنی ہوئی ہے۔ 1973ء میں لاہور میں سلام مچھلی شہری کا انتقال ہوگیا۔

گیت

جمنا کی لہریں اٹھتی ہیں
کچھ کہتی، کچھ گاتی ہیں
اور گاتے گاتے سپنوں کی دنیا میں کھو جاتی ہیں
کیا جانے کیا کہہ جاتی ہیں آکاش کے ہنس مکھ تاروں سے
کیا جانے کیا سن جاتی ہیں اس دنیا کے نظاروں سے
جمنا کی لہریں اٹھتی ہیں
کچھ کہتی، کچھ گاتی ہیں
اور گاتے گاتے سپنوں کی دنیا میں کھو جاتی ہیں
شیشے سے بھی نازک لہروں پر کتنی پرچھائیں پڑتی ہیں
جب تاج محل کچھ کہتا ہے ممتاز کی صورت ہنستی ہے
جمنا کی لہریں اٹھتی ہیں
کچھ کہتی، کچھ گاتی ہیں
اور گاتے گاتے سپنوں کی دنیا میں کھو جاتی ہیں
میں ان لہروں پر بھیجوں گی جیون کے ہزاروں خواب ابھی
یہ آنسو، یہ نازک کلیاں، یہ چاندنی، یہ مہتاب ابھی
آشائیں فنا ہو کر بھی جہاں کچھ امرت رس بہاتی ہیں
جمنا کی لہریں اٹھتی ہیں
کچھ کہتی، کچھ گاتی ہیں
اور گاتے گاتے سپنوں کی دنیا میں کھو جاتی ہیں

لفظ و معنی

صنف	۔	شاعری میں قسم کو صنف کہتے ہیں
رائج	۔	جاری، قائم
قلی قطب شاہ	۔	مغلیہ عہد کے آخری دور میں دکن کا آزاد حکمراں
نغمے	۔	گانے
عکاسی	۔	تصویر کشی
نغمگی	۔	موسیقی
سبک رو	۔	ہلکے پھلکے، آسان
حلاوت	۔	مٹھاس
منفرد	۔	جداگانہ
شناخت	۔	پہچان
عہدِ حاضر	۔	موجودہ دور
قابلِ فخر	۔	عزت اور مرتبہ کے قابل
سپنوں	۔	خواب
آکاش	۔	آسمان
نظاروں	۔	مناظر (منظر کی جمع)
گیتا	۔	ایک نسوانی کردار جو اپنے عاشق گھنشیام کی محبوبہ تھی۔
جیون	۔	زندگی
مہتاب	۔	چاند
آشائیں	۔	امیدیں
فنا	۔	ختم ہونا
امرت	۔	آبِ حیات
رس	۔	شربت

آپ نے پڑھا

- جمنا ندی کی حسین لہروں میں زندگی ہے، کچھ درد اور داستان ہے جو ندی اپنی لہروں کے ذریعہ کہنا چاہتی ہے اور لہریں اپنی زبان میں دردِ دل کو گاتی بھی ہیں۔ لہریں گاتے گاتے خوابوں کی حسین دنیا میں کھو جاتی ہیں۔
- ندی کی یہ لہریں آسمان کے ہنستے ہوئے روشن تاروں کی طرح نہ جانے اپنی حرکت اور عمل کے ذریعہ کیا کہنا چاہتی ہیں؟ لہروں کے اٹھنے گرنے اور اچھلنے میں کیا کیا راز ہے؟ یہ لہریں ہر روز دنیا کے مناظر کو دیکھتی ہیں اور نہ جانے کیا سنتی ہیں اور کیا پاتی ہیں۔
- شیشہ سے بھی نازک اور صاف و شفاف لہروں پر نہ جانے کتنے لوگوں کا عکس پڑتا ہے اور یہ لہریں مختلف پرچھائیوں کو اپنے نازک دامن میں سمیٹ کر نہ جانے کن کا غم غلط کرتی ہیں۔ بے جان عمارت تاج محل بھی اپنی خاموش زبان سے کچھ کہتا ہے جس زبان کو صرف محبوب بیگم ہی سن پاتی ہے اور مسکرا اٹھتی ہے۔ شاعر نے گیتا کے حسین خوابوں سے بہت دور اس کے عاشق گھنشیام کو دردِ فراق میں بنسی بجانے کی تشبیہ پیش کی ہے گویا ندی کی لہروں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔
- جمنا ندی اپنی لہروں میں نہ جانے کتنے درد، غم، تڑپ، کسک اور ہجر و وصال کی پرچھائیوں اور خوابوں کو دیکھ چکی ہے۔ ہزاروں ہزار کے غم، آنسو، نشاط، کرب اور طرب کو اپنی لہروں کے ذریعہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئی ہے اور ابھی ہزاروں ہزار خوابوں کو اپنی لہروں کی گود میں سلائے گی۔ ندی ناامید نہیں ہے۔ ندی کو یقین ہے کہ ان خوابوں کی تعبیر سامنے آئیں گی۔ امید فنا ہو کر بھی محبوب کو امید اور وصل کا امرت رس نوش کراتی ہے۔

معروضی سوالات

1. سلام مچھلی شہری کس صنفِ شاعری کے شاعر ہیں؟

(الف) غزل　(ب) مرثیہ　(ج) نظم　(د) گیت

2. جمنا ندی ہمارے ملک کے کس صوبہ سے زیادہ گزرتی ہے؟

(الف) اتر پردیش　(ب) ہماچل پردیش　(ج) اترا کھنڈ　(د) بہار

3. تاج محل کس مغل بادشاہ نے تعمیر کرائی تھی؟

(الف) ہمایوں　(ب) اکبر　(ج) جہانگیر　(د) شاہجہاں

4. ذیل کے شعر کا دوسرا مصرع پورا کریں۔

کیا جانے کیا کہہ جاتی ہیں ....

5. آکاش کا مترادف لفظ ذیل میں کون ہے؟

(الف) آفتاب (ب) خورشید (ج) افق (د) آسمان

مختصر سوالات

1. سلام مچھلی شہری کی زندگی پر پانچ جملے لکھیے۔
2. مغل بادشاہ شاہجہاں نے تاج محل کیوں تعمیر کی؟
3. گیت لکھنے والے چار مسلم شاعروں کے نام بتائیں۔
4. اس نظم میں شاعر نے کس کو بنسی بجاتے ہوئے پیش کیا ہے؟
5. آشائیں فنا ہوکر کیا بہاتی ہیں؟

طویل سوالات

1. سلام مچھلی شہری کی شاعری اور حالات زندگی پر ایک مضمون لکھیے۔
2. شاعر اپنی نظم 'جمنا کی لہریں اٹھتی ہیں' میں کیا کہنا چاہتا ہے؟ تفصیل سے لکھیے۔
3. مندرجہ ذیل لفظوں سے جملے بنایئے۔

لہریں، نظاروں، حسین، صورت، فنا، نازک، چاندنی، خواب، پرچھائیں، جیون

4. اردو میں گیت کے ارتقاء پر روشنی ڈالیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے اسکول کے کتب خانے یا کسی مشہور کتب خانے سے پانچ اردو شاعروں کے دو دو گیت منتخب کر کے ایک کتابچہ تیار کریں۔
2. اپنے گھر کی عورتوں اور رشتہ دار عورتوں سے گیت سنانے کی فرمائش کریں اور ان کو لکھتے بھی جائیں۔
3. اپنے استاد اور رشتہ دار عورتوں سے گیت کے لہجے، دھن اور لفظوں کی حسن ادائیگی کو سیکھیں اور اس کی مشق برابر کرتے رہیں۔